

۱۵/۹۵

کتاب

قیمت فی کاپی ۱۰/-

تصانیف نیاز فچوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

”من ویزداں“

مولانا نیاز فچوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک
غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع
انسانی کو ”انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ“ کے ایک رشتہ سے
وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق،
دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر
تاریخی، علمی، انفرادی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے نہایت بلند افکار
اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

صفحات ۶۷۲ - مجلد - سات روپیہ آٹھ آنے (دو روپے)
علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من ویزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی
تفصیل نہرست ہے:۔۔۔ اصحاب کہف - معجزہ و کرامت -
انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفان نوح -
نفس کی حقیقت - مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دہان ماہی -
حس یوسف کی داستان - قارون - سامری - علم غیب -
وعدہ توبہ - نقمان - عالم برزخ - یاجوج ماجوج - ارواح ماریت
حوض کوثر - امام ہمدی - نور محمدی اور بل صراط - آتش خرد و غیرہ

صفحات ۴۲۴ - کاغذ سفید و ہمیز -
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد	حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے	جمالستان	نگارستان
اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے ساتھ تحقیقات ہمسرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کہاں کہاں رائج ہوئی نیز کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ڈیشن	حضرت نیاز کے افسانوں کا قلم مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء و طبع کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے ساتھ تحقیقات ہمسرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کہاں کہاں رائج ہوئی نیز کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ڈیشن	ادبی نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا اور افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس ڈیشن میں متعدد افسانے اور کے گئے ہیں جو پہلے ڈیشنوں میں نہ تھے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول	حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا انمازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے صفحہ امت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

خریداران نگار اور ایجنٹ صاحبان پہلے سے پڑھیں

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک عمر کے آثار اجدید تالیف

جو بطور ضمیمہ آئندہ جنوری ۱۹۵۷ء سے ہر مہینے شائع ہوتی رہیگی اور عرصہ تک اس کا سلسلہ جاری رہے گا

دنیا کا مستقبل کیا ہے، ————— "صنعت و دولت کی ہوس کا انجام کیا ہوگا" ————— "سائنس کی ترقی انسان کو کس طرف لئے جا رہی ہے" ————— اور سب سے زیادہ یہ کہ "دنیا میں واقعی کبھی امن و سکون قائم ہونا ہے یا نہیں" ————— یہ ہیں وہ سوالات جن پر اس وقت ہر شخص غور کر رہا ہے، لیکن کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتا ————— لیکن

حضرت نیاز کی اس تالیف میں آپ کو ان تمام باتوں کا جواب ملے گا اور ایسے تشفی بخش انداز میں کہ آپ کی یہ خلش و جستجو باقی نہ رہے گی۔

یہ تالیف تین حصوں میں منقسم ہوگی ————— پہلے حصہ میں ۱۷۷۷ء کی جنگ کے اقتصادی و سیاسی نتائج سے بحث کی جائے گی کیونکہ یہی اصل بنیاد ہے دنیا کے موجودہ اقتصادی بحران کی اور اس سلسلہ میں مشرق و مغرب کے ان تمام سیاسی، معاشرتی و سیاسی انقلابات سے بحث کی جائے گی، جو جنگ کی وجہ سے رونما ہوئے دوسرے حصہ میں دنیا کی موجودہ حالت پر تبصرہ کر کے بتایا جائے گا کہ ہوا کارخ کیا ہے اور تیسرے حصہ میں یہ ثابت کیا جائے گا کہ اگر، ارادہ خداوندی یہ نہیں ہے کہ کرۂ ارض کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا جائے تو آئندہ ساری دنیا کو ایک ہی حکومت سے وابستہ ہونا ہے اور وہ حکومت سائنس و مادہ کی نہ ہوگی، دولت و صنعت کی نہ ہوگی بلکہ مذہب و اخلاق کی ہوگی، روحانیت و انسانیت کی ہوگی، اور یہ وہ وقت ہوگا جب کرۂ زمین پر انسان کم ہوگا، لیکن انسانیت زیادہ، یعنی وہ وقت جب یہاں صرف ایک حکومت ہوگی ————— خدائی حکومت اور انسان مشینوں کی جگہ اسی کے سامنے اپنا سر جھکائے گا ————— یہ تالیف ایسی سادہ و سہل زبان میں ہوگی کہ معمولی پڑھا لکھا انسان بھی اسے سمجھ سکے ————— پھر —————

اگر آپ بیش بہا تالیف کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو نگار کی خریداری جاری رکھئے اور اس مقدس مقصد کی اشاعت کے لئے آئندہ جنوری ۱۹۵۶ء سے نگار کے جدید خریدار بھی پیدا کیجئے۔
اگر یہ تالیف علیحدہ کتابی صورت میں شایع ہوتی تو ڈیڑھ ہزار صفحات سے کم نہ ہوتی اور اسکی قیمت آپ کو پندرہ روپیہ ادا کرنا پڑتی، لیکن خریداری نگار کی صورت میں یہ کتاب آپ کو صرف دو روپیہ سالانہ ادا کرنے پر مل سکتی ہے۔

اسلئے جو حضرات اس ضمیمہ کو مستقلاً حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ازراہ کرم مطلع فرمادیں تاکہ ان کا نام آئندہ سالنامہ کا وی پی پی چھ روپیہ کی جگہ آٹھ روپیہ میں روانہ کیا جائے بصورت عدم اطلاع سالنامہ کا وی پی پی (بغیر ضمیمہ کے) بدستور چھ روپیہ پانچ آنے میں بھیجا جائیگا۔
جن حضرات کا چندہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں ختم نہیں ہوتا بلکہ ۱۹۵۷ء کے کسی مہینہ میں ختم ہوتا ہے وہ دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمادیں اگر یہ کتاب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ایکینٹ صاحبان کو سالنامہ ۱۹۵۶ء مع اس ضمیمہ کے دو روپیہ چار آنے میں ملیگا اور بغیر ضمیمہ کے دو روپیہ میں (مکیشن ۲۵ فی صدی) سالنامہ کے بعد کے پرچے مع ضمیمہ کے بارہ آنے میں اور بغیر ضمیمہ کے حسب دستور دس آنے میں ملیں گے (مکیشن ۲۵ فی صدی)۔

چونکہ اس کتاب کا ضمیمہ صرف اتنی ہی تعداد میں چھپے گا جتنا درکار ہوگا، اس لئے ایکینٹ صاحبان پہلے ہی سے مطلع کر دیں کہ ان کو ضمیمہ والے اور بے ضمیمہ والی کتنی کاپیاں درکار ہیں

مینجر نگار۔ لکھنؤ

جوش ملیح آبادی کی مشہور نظم حرف آخر

ابھی تک مکمل شائع نہیں ہوئی، لیکن اس کے مختلف اجزاء، رسائل و جرائد میں آچکے ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ واقعی وہ جوش کے طنز و تیات کی آخری حد ہے، جس میں خدا سے خطاب کر کے انسان وہ سب کچھ کہ گیا ہے جو عالمِ مرتبی میں کہہ سکتا ہے اس میں شک نہیں یہ نظم واقعی جوش کا حرف آخر ہے، لیکن اس کے جواب میں ایک دوسرے شاعر کا حرف آخر بھی سن لیجئے۔

”قولِ فصیل“

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدر آبادی نے جوش کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے، کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے، جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے، اس نظم میں جو ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے، شیطان و شاعر کا مکالمہ کے ذریعہ سے رموز کائنات اور اصرارِ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہو، وہی اس کی فنی حیثیت سو ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اختر کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ فنی شعری اس سے زیادہ ترقی کی تمنا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

معہ مقدمہ از نیاز فتحپوری - کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز - گرد پوش رنگین - قیمت دو روپیہ

شادی کے باب میں عمر کا تفاوت کتنا بڑا ظلم ہے

یہ ہے اصل مسئلہ جس پر جناب نظیر جمیلی ام۔ اے نے اس کتاب میں قلم اٹھایا ہے۔ پھر یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبہ بہار کا اور ایسا دردناک واقعہ کہ کوئی اسے فراموش کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک معمر شوہر کی جوان بیوی اور اس کے سوتیلے جوان لڑکے کی داستانِ معاشقہ ہے اور اس درجہ دلچسپ اندازِ بیان میں کہ پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس ناول کی جان وہ خط ہے جو بیوی نے اعترافِ قصور میں اپنے شوہر کو لکھا ہے اور جس کو پڑھنے کے بعد بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

گوہر ————— گوہر ————— گوہر

قیمت ایک روپیہ

تین مقدس ہستیاں بے نقاب

ایک جید مولوی، ایک صاحبِ دل درویش، ایک مشہور ناظمِ تنظیم خانہ۔ یہ تین مقدس ہستیاں جن کے چہرہ سے نقاب الٹ کر حضرت نیاز نے ان کے صحیح خدو و خال آپ کے سامنے پیش کئے ہیں۔ آپ پڑھ کر حیران رہ جائیں گے کہ کیا مذہب، تصوف و اخلاق کے پردے میں انسان اس قدر دروہ ہو جاتا ہے۔ یہ تینوں افسانے حضرت نیاز نے اپنی دوہرا نشا پرداز سی کے اس دور میں لکھے تھے جب ان کا طنز اور مزاح اپنی پوری جوانی پر تھا۔ اگر آپ نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہ کیا ہو تو اب ملاحظہ فرمائیے: ”نقاب اٹھ جانے کے بعد“ - قیمت آٹھ آنے

دی نخل لائن لمیٹڈ

(سب پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی)

محکمہ امر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بھی ہے۔

عدن، پورٹ، سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور

خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت

دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے۔

ٹرنر مارینس اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک اسٹریٹ ممبئی

سالنامہ "نگار" ۱۹۶۹ء

اتنی عظیم الشان ادبی خدمت ہے، کہ اس کی اہمیت سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ذیل کی فہرست سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سالنامہ قدیم و جدید تنقید کا کتنا زبردست سنگم ہے اور ادبی معلومات میں جو اضافے آپ کو اس کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں، وہ کسی دوسری طرح میسر آ ہی نہیں سکتے۔

ذیل کی فہرست سے آپ کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے :-

مکاتیب رجب علی بیگ سرور	نیا زفتچوری
غزل کی اہمیت	کلام آسی
ہماری شاعری کا ایک نیا میلان	کلام آزاد انصاری
تنقید کے ایک نئے نقطہ نظر کی ضرورت	میر اور خارجی حالات کی ترجمانی
اسلوب بیان	اثر دہلوی
نئے شاعر	میر شیر علی افسوس
اردو میں قصیدہ و مثنوی	میر معنون دہلوی کی شاعری
غزل میں انشا کا اجتہاد	انعام اللہ خاں یقین
فانی	صفیر بلگرامی
ترقی پسند ادب	لکھنؤ کی داستان گوئی
لکھنؤ اور اردو ادب	مدح یا ہجو
آتش کی عشقیہ شاعری	اردو غزل میں تسوٹ
	عزیز لکھنوی کی شاعری
	فضل الدین اثر

یہ سالنامہ نگار کے سالانہ چندہ (چھ روپیہ پانچ آنے) میں شامل ہے۔ اس کی قیمت زائد نہیں لی جائے گی۔

غیر خریداران نگار سے سالنامہ ۱۹۶۹ء کی قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

نیچر نگار - لکھنؤ

مذہب کے متعلق آپ کے دل میں بہت شکوک ہوں گے

آپ سوچتے ہوں گے کہ خدا کیا ہے، رسول کون ہو سکتا ہے، الہامی کتابوں کی کیا حقیقت ہے، دوزخ و جنت سے کیا مراد ہے، شہر نشتر کی کیا اصلیت ہے، عذاب و ثواب کا کیا مفہوم ہے، روح کسے کہتے ہیں۔ اسی طرح تمام عقاید مذہبی کے متعلق آپ کبھی دیکھی ضرور سوچتے ہوں گے اور جب آپ کسی نتیجہ تک نہ پہنچتے ہوں گے تو بڑی اُلجھن میں پڑ جاتے ہوں گے۔ پھر آپ کو یہ اُلجھن دور کرنا ہے اور تعلیمات اسلام کی اصلی روح جاننا ہے تو ”من ویزداں“ کے دونوں حصے ملاحظہ فرمائیے۔ جو مولانا نیا ز فتحپوری کی ۴۰ سال کی کاوش و تحقیق اور ۵۰ سال کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مذہب و متعلقات مذہب سے واسطہ رکھنے والا کوئی سوال ایسا نہیں ہے جس کا جواب آپ کو ان کتابوں میں نہ ملے اس کے علاوہ زور تحریر اور حسن بیان کے لحاظ سے بھی یہ اتنا بڑا ادبی کارنامہ ہے کہ اس کی مثال آپ کو کہیں اور مل ہی نہیں سکتی۔

”من ویزداں“ حصہ اول - ۶۴۲ صفحات مجلد مع رنگین گرد پوش، کاغذ سفید ۲۸ پونڈ

سات روپیہ آٹھ آنے

”من ویزداں“ - حصہ دوم صفحات - مجلد - کاغذ سفید - ۴۴۲ پونڈ - پانچ روپیہ آٹھ آنے

دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول بارہ روپیہ

منیجر منگل

شمار (۴)

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۶۹ء

جلد (۵۶)

۴۶	مارشل پلان کا اثر روس پر
۴۸	باب لاسٹفسار
۵۰	خدا حافظ! (نظم) - پروفیسر شورشور
۵۲	صبح سے پہلے (نظم) - افسر سیما بی
۵۳	اعتراف (نظم) - پروفیسر شمس شیدائی ام۔ لے
۵۴	انتخاب کلام سالک دہلوی
۵۵	مطبوعات موصولہ
۶۲	مرثیہ نگاری اور میر تقی - ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
۵۷	
۸۸	

۵	ملاحظات
۹	ترقی پسند ادب اور صحافت - سہیل بخاری بی۔ لے
۱۵	کاغذ کی قوت
۱۷	مشہور شاعر گمنام غزلگو - خلیل الرحمن عظمیٰ
۲۶	ام۔ ان۔ رائے کی مشہور کتاب - عبد المالك روى
۳۱	بانی تحریک کی روح و رواں
۳۴	ماحول و وراثت کا اثر انسانی زندگی پر - خواجہ حبیب اللہ احمد ام۔ لے
۳۹	ذوق کا تغزل - بدری پرشاد - ام۔ لے
۴۴	چاند تک تین دن میں

ملاحظات

روپیہ۔ اسٹرلنگ اور ڈالر وہ صبح بھی کس قدر عجیب صبح تھی جب ہندوستان کے تمام اخباروں نے نہایت جلی حروف میں اسٹرلنگ اور روپیہ کی قیمت کم کر دئے جانے کا اعلان کیا۔ خواص نے اسے جو کچھ سمجھا ہو، لیکن عوام میں یہی چہرہ چاہتا تھا کہ اب روپیہ کے سرف بارہ آنے بلکہ اس سے بھی کم ملیں گے اور دس روپیہ کے نوٹ لوگ آٹھ آٹھ میں لینے لگے۔ سونے کا بھاؤ دفعتاً بڑھ گیا، چیزوں کی قیمت چڑھنے لگی اور لوگ گھبرائے ہوئے پھرنے لگے کہ اب کیا ہوگا۔ وہ تو کہتے کہ بینک اور ڈاک خانے بند کر دئے گئے، ورنہ شاید ایک ہی دن میں اتنا روپیہ بنکوں سے نکل جاتا کہ ان میں سے اکثر دیوالیہ ہو جاتے۔ ایک صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور پوچھنے لگے کہ ”بینک میں جو میرا روپیہ جمع ہے، کیا وہ پورا نہ لے گا“ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ خیال ان کے دل سے نکل جائے، لیکن وہ مطمئن نہ ہوئے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس خبر کی سرخی متعین کرنے میں حکومت اور اخبار دونوں سے غلطی ہوئی۔ ان کو یہ نہ کہنا چاہئے تھا کہ ”روپیہ کی قیمت کم کر دی گئی“ بلکہ یہ اعلان کرنا چاہئے تھا کہ ”روپیہ کی شرح تبادلہ بدل گئی ہے“۔ اس صورت میں لوگوں میں اضطراب پیدا نہ ہوتا، کیونکہ ”شرح تبادلہ“ وہ چیز ہے جسے پڑھے لکھے بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ عوام اور اس طرح وہ ہول نہ پیدا ہوتا جو روپیہ کی کمی قیمت کی خبر سن کر قد رثا ان کے دل میں پیدا ہونا چاہئے تھا۔

بہر حال وہ تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ اب آئیے غور کریں کہ قصہ ہو کیا ہے تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ تمام دنیا میں ایک ہی سکہ نہیں چلتا، کہیں اس کا نام اسٹرلنگ ہے، کہیں روپل، کہیں فرانک، کہیں روپیہ اور کہیں ڈالر۔ اسی کے ساتھ یہ بھی آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کی قیمتیں مختلف ہوتی ہیں، یعنی جب ان سکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تبدیل کیا جاتا ہے تو مختلف قیمتوں پر ان کا لین دین ہوتا ہے اور اسی کو ”شرح تبادلہ“ کہتے ہیں۔ فرس کیجئے کہ ہندوستان سے تین لاکھ روپیہ کا مال امریکہ جاتا ہے تو وہاں اسکی قیمت ڈالر کے حساب سے لگائی جائے گی یعنی اگر ڈالر اور روپیہ کی شرح تبادلہ ایک اور تین کی نسبت سے ہے تو اس مال کی قیمت ایک لاکھ ڈالر قرار پائے گی اور اسی قیمت تک کا مال ہندوستان امریکہ سے حاصل کر سکے گا۔

چونکہ ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ اس کی دولت کا بڑا حصہ ملک کے اندر ہی رہے اس لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے یہاں کی اشیاء زیادہ سے زیادہ باہر بھیجے اور باہر کی چیزیں کم سے کم منگائے یا اصطلاحی الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ برآمد کے مقابلہ میں درآمد کم رکھنا چاہتا ہے اور جس ملک کی درآمد برآمد کے مقابلہ میں جتنی کم ہوتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ دولت مند سمجھا جاتا ہے۔

دنیا میں دو چیزیں ہیں ایک صنعت وہ سری پیداوار اور یہ ہر جگہ یکساں نہیں ہوتیں، کہیں پیداوار زیادہ ہوتی ہے اور صنعت کم کہیں صنعت زیادہ ہے اور پیداوار کم۔ پھر پیداوار کی بھی قسمیں ہیں بعض ایسی ہیں جن کا تعلق براہ راست ہماری زندگی سے ہے

مثلاً غلہ اور بعض ایسی ہیں جو صنعت کے کام آتی ہیں، جیسے لوہا، تانبہ، ٹین، چمڑا، جوٹ اور روئی وغیرہ اور ان کے باہمی تبادلہ کی سہولت یہ ہوتی ہے کہ فرض کیجئے ہندوستان کی غذائی پیداوار کافی نہیں ہے تو وہ دوسرے ملکوں سے درآمد کرتا ہے اور چونکہ اس کی صنعت بھی ترقی یافتہ نہیں ہے اس لئے وہ اپنی دوسری پیداوار دوسرے ملکوں کو ارزاں دینے پر مجبور ہوتا ہے، اور اس پر طرہ یہ کہ انہیں خام اشیاء کی بنی ہوئی چیزیں بھرا سے گراں لینا پڑتی ہیں۔ مثلاً ٹین کو لیجئے کہ اگر ہندوستان سو روپیہ من کے حساب سے امریکہ کے ہات فرودخت کرتا ہے تو اسی ٹین کی بنی ہوئی چیزیں اسے امریکہ سے سیکڑوں گنا زیادہ قیمت ادا کر کے خریدنی پڑتی ہیں۔

الغرض پیداوار اور صنعت کے مقابلہ میں ہمیشہ صنعت کو کامیابی ہوتی ہے اور اسی لئے ہر ملک صنعتی ترقی کی کوشش میں رہتا ہے تاکہ جس طرح ممکن ہو درآمد کو کم کیا جائے اور برآمد کو بڑھایا جائے۔ اس وقت ساری دنیا میں امریکہ ہی ایک ایسا ملک ہے جو پیداوار اور صنعت دونوں حیثیتوں سے کسی کا محتاج نہیں اور اسی لئے اس کی برآمد، درآمد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے اور دنیا کا ہر ملک اس کا دست نگر ہے۔ پھر چونکہ وہاں اشیاء کی قیمت ڈالر میں ادا کرنا پڑتی ہے اس لئے ہر ملک یہی چاہتا ہے کہ اپنی پیداوار یا اپنی مصنوعات زیادہ سے زیادہ امریکہ بھیج کر ڈالر حاصل کر سکے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ انگلستان، اسٹریٹنگ کی قیمت کم کر کے اور ہندوستان روپیہ کی قیمت گھٹا کر فائدہ میں رہیں گے یا نقصان میں۔ یہ بالکل درست ہے کہ کسی ملک کے سکے کی قیمت کم ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ وہاں کی اشیاء دوسرے ملکوں کو بہت ارزاں ملیں گی اور ان کی برآمد بڑھ جائے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ انگلستان و ہندوستان کس چیز کا سودا کریں گے، ظاہر ہے کہ صنعتی حیثیت سے تو یہ امریکہ کا مقابلہ نہیں سکتے اس لئے اسٹریٹنگ اور روپیہ کی قیمت کم ہو جانے سے ان کی خام پیداوار ہی کی کھپت امریکہ میں زیادہ ہو جائے گی، لیکن اگر اس کے عوض میں انہوں نے امریکہ کی مصنوعات حاصل کیں تو وہ بدستور اسی گراں قیمت پر لینا پڑیں گی کیونکہ ڈالر کی قیمت تو اپنے حال پر قائم ہے۔

ہندوستان کی حکومت کی طرف سے جو اعلان ہوا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آئندہ وہ امریکہ سے بہت کم چیزیں لیگی، یعنی اپنے یہاں کی خام پیداوار تو وہاں زیادہ بھیجے گی لیکن وہاں کی اشیاء بہت کم خریدے گی۔ اس وقت تک علاوہ دیگر اشیاء کے امریکہ سے غلہ بھی یہاں بہت آتا تھا، اور اب حکومت ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس سے تک خود اپنی پیداوار کو اتنا بڑھائے گی کہ کہیں باہر سے اسے لینا پڑے اور اگر اس کی ضرورت ہو بھی تو بجائے امریکہ کے اسٹریٹنگ علاقہ سے حاصل کرے۔ حالانکہ اسٹریٹنگ علاقہ کا سب سے بڑا ملک انگلستان خود اس باب میں محتاج ہے اور اگر وہ باہر سے غلہ نہ منگائے تو بھوکوں مر جائے۔ بہر حال یہ خیال بہت مبارک ہے اور خدا کرے اس میں کامیابی حاصل ہو، لیکن محض غلہ کی درآمد بند کرنے سے تو ملک کی اقتصادی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت صنعتی ترقی کی ہے اور صنعتی ترقی کے لئے مشینیں درکار ہیں۔ پھر مشینیں کہاں سے آئیں گی۔ اسی امریکہ سے جس کے ڈالر کے عوض میں ہندوستان کو اب بجائے تین کے پانچ ادا کرنے پڑیں گے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ مشینوں کی درآمد اب اسٹریٹنگ علاقوں سے کی جائے گی، لیکن اس میں کامیابی مشکل ہے کیونکہ اسٹریٹنگ علاقوں

کی صنعت خود امریکہ کی مشینوں کی محتاج ہے وہ کیا ہندوستان کو دیں گے اور اگر کوئی چیز فراہم بھی کی تو اس کا تعلق موٹر وغیرہ قسم کے اسباب تعیش سے ہوگا، نہ کہ صنعت بڑھانے والی مشینوں سے۔ بہر حال یہ حالات موجودہ اگر ہندوستان کو اپنی بھاری صنعت بڑھانا ہے تو اسے امریکہ ہی سے سب کچھ منگانا پڑے گا اور روپیہ کی قیمت گھٹ جانے سے بہت زیادہ دام دینا پڑیں گے۔

حکومت کی طرف سے جو بیانات شائع ہوئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ روپیہ کی قیمت گھٹ جانے کی وجہ سے اشیاء کی گرانی کا اندیشہ اسے بھی ہے، لیکن وہ اس کی روک تھام سختی سے کرے گی۔ جس حد تک اشیاء کے دام بڑھ جانے کا تعلق ہے وہ اندیشہ سے گزر کر حقیقت ہو گئی ہے اور نہ صرف امریکی اشیاء بلکہ دوسرے ملکوں کی چیزوں کے دام بھی بازار میں بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ امریکن دواؤں میں سے پنسلین اور اسٹریپٹومائسین جو نہایت ضروری مرکبات ہیں، کنٹرول، پرمٹ، سرٹیفیکٹ وغیرہ کے حدود میں آگئی ہیں اور مشکل ہی سے کسی کو مل سکتی ہیں۔ یہی حال دوسری دواؤں اور امریکہ کی دیگر مصنوعات کی گرانی کا ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان میں جو اسٹاک موجود ہے وہ پہلے کا منگایا ہوا ہے اور اس کی قیمت بڑھنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن حکومت اس کا کوئی انسداد نہیں کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔

حکومت نے ایک تدبیر اس کے انسداد کی یہ بھی بتائی ہے کہ خریدار دام زیادہ نہ دیں، یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اسی وقت جب ملک کی ساری آبادی اس پر عمل کرے۔ اگر دس نے اس پر عمل کیا اور پچاس نے پروا نہ کی تو اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ انسان کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اسے حاصل کرتا ہے خواہ کتنی ہی زیادہ قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے، فرض کیجئے کہ کسی کا بچہ دق میں مبتلا ہے اور اسے اسٹریپٹومائسین کی ضرورت ہے تو وہ بلیک مارکیٹ میں ایک کے دس ادا کر کے یقیناً لے لیگا اور حکومت کے اس مشورہ پر کبھی عمل نہ کرے گا کہ زیادہ دام نہ دے جائیے۔ یہی حال تمام دوسری ضروریات زندگی کا ہے اور حکومت کے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ وہ لاکھوں اشیاء کی قیمت مقرر کر کے دوکانداروں اور خریداروں کو اسی مقررہ قیمت پر بیچنے اور لینے پر مجبور کر سکے۔ نہ وہ ملک کے تمام دوکانداروں کے اسٹاک کی فہرست بنا سکتی ہے اور نہ اسے اپنے قبضہ میں لیکر خود ان کے فروخت کا انتظام کر سکتی ہے۔ بہر حال روپیہ کی قیمت گھٹا دینے سے اگر ہندوستان اپنے یہاں کی تمام پیداوار کے لئے سستے بازار پیدا کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس سے اس کی خوشحالی بڑھتی ہوئی نظر نہیں آتی کیونکہ اسے باہر کی مصنوعات اور اپنی صنعت بڑھانے کے لئے مشینیں بدستور امریکہ سے بہت زیادہ دام دیکر منگانا پڑیں گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں کی ضروریات زندگی کے دام بڑھ جائیں گے، مزدور اور عمال زیادہ اجرت و تنخواہ طلب کریں گے اور پھر وہی اسٹراک، مار دھاڑ، اور سرمایہ و عمل کی جنگ شروع ہو جائیگی جس سے کمیونسٹ طبقہ کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔

لانا کہ حکومت، امریکہ سے غلہ نہ منگائے گی اور وہ دو ڈھائی سیر فی روپیہ کے حساب سے گہیوں سب کو دیتی رہے گی، تو بھی ملک اس سے مطمئن نہ ہوگا، کیونکہ غلہ کے علاوہ ضروریات زندگی اور بھی بہت ہیں، جن کی گرانی کا اثر اس کی آمدنی پر ضرور پڑے گا اور یہی اصل بنیاد ہے اضطراب اور بے چینی کی۔

ہاں اگر ہندوستان اس کا انتظام کر سکے کہ وہ اپنے ملک کی پیداوار کا بڑا حصہ ملکی صنعت ہی کے فروغ دینے میں صرف کرے اور زندگی کی اکثر ضروریات وہ ہی خود اپنی صنعت سے پورا کرے تو بیشک فائدہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تجارتی صنعتوں کی جگہ جاپان کی طرح گھریلو چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو ترقی دے اور اس کے لئے خود ہی چھوٹی چھوٹی مشینیں طیار کرے، مگر اس کے لئے بھی کافی زمانہ چاہئے۔ ہندوستان کو ان اُلجھنوں کے علاوہ ایک اور نقصان یہ بھی ہو گا کہ اس کا جو قرض اسٹریٹنگ کی صورت میں برطانیہ پر پایا جاتا ہے اس کی قیمت تقریباً ۴۰ فی صدی کم ہو جائے گی، یعنی اگر اس قرض کے عوض میں وہ انگلستان سے پہلے سو فیصد کی چیز منگا سکتا تھا تو اب صرف ستر ہی کی طلب کر سکے گا۔

اس سلسلہ میں اس پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ برطانیہ نے کیوں اسٹریٹنگ کی قیمت کم کر دی، اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ملکوں کا جو قرض اسٹریٹنگ کی صورت میں اُس پر واجب ہے اس کی مقدار گھٹ جائے اور قرض کے عوض اسے کم مال دینا پڑے، لیکن اندرونی اسباب کچھ اور بھی ہوں گے، چنانچہ بعض کا خیال یہ ہے کہ برطانیہ نے یہ دیکھ کر کہ صنعت و تجارت میں چونکہ وہ اب امریکہ کے مقابلہ میں نہیں آ سکتا اس لئے اس نے سوچا کہ کیوں نہ امریکہ ہی کے مفاد کو سامنے رکھ کر دنیا کے تمام بازار اس کے حوالہ کر دئے جائیں اور اسکے عوض میں وہ ایشیا میں امریکہ کے ساتھ مشترکہ تجارت کے حقوق حاصل کر سکے۔ بہر حال یہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اپنے روپیہ کی قیمت گھٹا کر نقصان میں رہے گا، لیکن جس وقت ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر باہر حکومت نے بھی آخر کچھ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہو گا اور وہ اتنے احمق تو نہیں ہو سکتے کہ جان بوجھ کر اپنا نقصان کریں تو تسلی بھی ہو جاتی ہے کیونکہ یہ مسائل بہت پیچیدہ ہیں اور ماہرین ہی ان پر صحیح رائے دینی کر سکتے ہیں۔

پاکستان نے اپنے روپیہ کی شرح تبادلہ بدستور وہی قائم رکھی جو پہلے تھی، اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے، کیونکہ امریکہ کے بعد دنیا میں پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی برآمد، درآمد سے زیادہ ہے اور وہ امریکہ سے جتنا مال منگاتا ہے اس سے زیادہ کا مال وہ خود وہاں بھیجتا ہے اس لئے اگر وہ اپنے روپیہ کی قیمت گھٹا دیتا تو اسے سخت نقصان ہوتا اور امریکی مال کے دام اسے بھی زیادہ دینا پڑتے۔ پاکستان، جوٹ، روٹی اور غلہ کی پیداوار کے لحاظ سے بڑا خوش قسمت ہے۔ اس وقت جبکہ ہندوستان اور بہت سے دوسرے ممالک باہر سے غلہ منگا رہے تھے، پاکستان اپنا غلہ باہر بھیج رہا تھا اور امریکہ کو روٹی اور جوٹ اتنی مقدار میں فراہم کر چکا تھا کہ اس کے پاس ڈالروں کی کمی نہ تھی۔ اور اگر یہ خبر صحیح ہے کہ اپنا اسٹریٹنگ قرض بھی وہ ڈالر میں تبدیل کر چکا ہے تو پھر اس کا جو قرض اسٹریٹنگ کی صورت میں برطانیہ پر واجب ہے اس پر بھی اسٹریٹنگ کی قیمت گھٹ جانے سے اسے کوئی نقصان پہونچا۔

اس میں شک نہیں کہ اس کی روٹی اور جوٹ کی درآمد پر ضرور اثر پڑے گا۔ اور اگر وہ اسٹریٹنگ والے ملکوں کو مال بھیجنے پر مجبور ہوا تو اسے اپنے سکے کی قیمت بھی کم کرنا پڑے گی لیکن اگر اس نے ڈالروں کے ممالک ہی سے لین دین قائم رکھا تو وہ فائدہ میں رہے گا۔

پاکستان کے جوٹ اور روٹی کی ہندوستان میں بہت کھپت ہے اور اگر ہندوستان نے اس کی خریداری سے ہاتھ کھینچ لیا جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے تو اسے دوسرے بازار ڈھونڈنے پڑیں گے جس میں اتنی آسانی سے اسے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اس وقت تو پاکستان کی پالیسی اسکے لئے مفید ہو آئندہ جو کچھ ہو۔

ترقی پسند ادب اور صحافت

اختلاف خیال بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ ہر زندہ تحریک کی خصوصیت ہے۔ اس لئے تحریک کے ہر بہی خواہ کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ اس کو خوش آمدید کہے۔ اس کی روشنی میں تحریک کے حسن و قبح پر غائر نظر ڈالے اور اس کی خامیوں کی تلافی اور خوبیوں کو زیادہ اجاگر کرنے میں ہر ممکن جدوجہد کرے۔ ”سعی و خطا“ کے اصول ہی سے انسان نے سب کچھ حاصل کیا ہے اور اسی کی مدد سے بہت کچھ حاصل کرے گا۔ ”خدا صفا ودع ماکدر“ کا لایکھ عمل کسی ایک عہد سے مخصوص نہیں ہے ہمیشہ کیلئے ہے۔ یہ ایک عالمگیر کلیہ ہے اور اسی میں دوامی ترقی کا راز مضمر ہے۔

اُردو ادب میں بھی ہمیں قدم قدم پر اختلاف ملتا رہا ہے اور ملتا رہے گا۔ ایک زمانہ تھا جب قدامت پرستوں اور ترقی پسندوں میں اختلاف پیدا ہوا اور عرصہ تک یہ اختلاف جاری رہا لیکن رفتہ رفتہ ترقی پسند ادب نے اپنا ایک مقام حاصل کر ہی لیا۔ اب بھی قدامت پرستوں کی جانب سے کبھی کبھی کچھ اعتراضات وارد ہو جاتے ہیں لیکن اب ان میں کچھ زور یا اثر باقی نہیں رہا ہے۔ اب قدیم و جدید کے درمیان واضح حد بندی ہو چکی ہے۔ لہذا اس اختلاف سے مزید کوئی خطرہ یا خدشہ نہیں رہ گیا۔ ۱۹۳۰ء سے جبکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی ترقی پسند ادب پر قدامت پرستوں کی جانب سے کتنے ہی حملے ہوئے لیکن وہ اپنے جاندار اور پائندہ اصولوں اور نظریوں، عصری تقاضوں اور مسائل حیات کی ٹھوس اور عالمگیر حقیقتوں کی بدولت ان سے نہ صرف جانبر ہی ہوا بلکہ اپنی مناسب اور امتیازی حیثیت کا مالک بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے صد مات سے محفوظ و مامون بھی ہو گیا۔

ان حلوں کے چند وجوہ بھی تھے۔ عصری حالات کے تحت ترقی پسند ادیبوں نے ادب کے مواد و ہیئت میں جدید نظریات و تجرباتی کے پیش نظر جہاں نئی نئی راہیں نکالیں وہاں ان میں سے کچھ گمراہ اور بے لگام بھی ہو گئے۔ یہ لوگ آزادی کے معنی بے راہ روی کے سمجھ بیٹھے اور ہر قسم کی قید و بند کو توڑ دینے ہی کو اصل ترقی پسندی تصور کرنے لگے۔ کچھ ایسے بھی نکلے جو نئے حالات و مقتضیات کے دباؤ کے تحت ہی نہ ہو سکے۔ ان میں ایک اخصابانی تشنج اور ایک ذہنی الجھن کی سہی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ان کی تخلیقات ایک مبہم، لالینی، بھول بھلیاں، اور مجذوب کی بڑھ کر رہ گئیں۔ کہنے کو تو وہ یہی کہتے رہے کہ یہ لاشعوری کوششیں ہیں۔ یہ آزاد تسلسل ہے لیکن دراصل وہ ان کی داخلی گھٹن اور دماغ کے عدم توازن کی غماز تھیں۔

ان نام باتوں نے مل جل کر ترقی پسند ادب کو ہونے ملامت بنا دیا۔ لیکن اس مخالفت سے تحریک کو بڑی مدد بھی ملی۔

ترقی پسندوں نے اپنی تخلیقات کا جائزہ لیا اور اپنے رجحانات میں جا بجا ترمیم و اصلاح بھی گوارا کر لی۔ پھر بھی ”ادب برائے زندگی“ کے پیش نظر ادب کو عوام سے قریب لانے کی کوشش میں پستی و ابتذال کو دور کرنے میں عام کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کا ایک سبب اور بھی تھا، انجمن کی داغ بیل پڑے ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی، حریف ملکوں کو اپنی فوجوں کی دبستگی اور اوقات فرصت گزارنے کے لئے ایسے ہلکے پھلکے لٹریچر کی ضرورت ہوئی جو عامیانہ مذاق و مزاج کو اس آسکے اور ان کے ذہنوں کے لئے تفریح کا سامان بہم پہنچا سکے۔ چنانچہ اس مطالبہ کے پیش نظر ادیبوں نے ارزاں اور عوام کے مذاق کا وقتی لٹریچر تخلیق کرنا شروع کر دیا۔ یہ بات دنیا کے تمام ملکوں میں عام تھی کچھ ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہ تھی۔ ہندوستان کے ترقی پسند اس عام اور عالمگیر رجحان سے دامن کشاں نہیں رہ سکتے تھے لہذا ان کی تخلیقات میں وقتی موضوعات پستی اور عامیانہ پن کا آجانا ایک ناگزیر امر تھا۔

یہ عالمگیر جنگ اگرچہ باضابطہ طور پر ۱۹۳۹ء میں ختم بھی ہو گئی لیکن اس کے اثرات ابھی تک بدستور قائم ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمیں گرائی، قحط، چور بازاری، نفع اندوزی، بے روزگاری اور بد حالی عرض ہر قسم کا سماجی اور معاشی انتشار حاصل ہوا۔ حیات کی بدلی ہوئی قدریں اور مسخ شدہ معیار۔ ہندوستانی ابھی ان لعنتوں اور مصیبتوں میں گھرا ہی ہوا تھا کہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی جس نے ملک کے طول و عرض کو اپنے وسیع دامن میں سمیٹ لیا اور عوام کو ایک شرمناک تباہی کے گہرے غار میں ڈھکیل دیا۔ ظاہر ہے کہ اس رستخیز بیجا میں ترقی پسند ادیب بھی الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ مصائب کے پہاڑ جن ادیبوں پر ٹوٹے ان کو تو خیر اس دور ابتلا کے عملی تجربات حاصل ہی ہوئے لیکن جو لوگ اس آگ کے شعلوں سے بچ بھی گئے وہ بھی ان کی حرارت سے کسی نہ کسی حد تک ضرور جھلسے اور عام انسانوں کی طرح اس خوفناک بربادی کے مناظر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بلکہ انھوں نے عوام کی بہ نسبت اپنی مخصوص شدت احساس کے باعث کچھ زیادہ ہی اثرات قبول کئے۔ چنانچہ یہ اثرات انکی فساد کی دور کی تخلیقات کے محرک بن گئے۔

اب ہمیں سے ترقی پسندوں کی جماعت میں اختلاف شروع ہو گیا اور وہ یہی اختلاف ہے جو آج ادب اور صحافت کے مباحثے کی شکل میں ادھر کچھ دنوں سے ہمارے سامنے آرہا ہے اور متعدد رسائل میں اس پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔ اب ترقی پسند دو اسکولوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، ان میں ایک اسکول کا خیال ہے کہ موجودہ ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے لیکن دوسرے مکتبہ خیال کا کہنا ہے کہ نہیں یہ ادب، ادب ہی ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی نے ”نگار“ ماہ مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک مقالہ سپر و قلم کیا تھا کہ موجودہ ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے، اور اس سلسلہ میں موصوف نے ترقی پسند ادب پر چند جہتی اعتراضات کئے تھے۔ اس کے جواب میں ”نگار“ ماہ اگست ۱۹۴۹ء کے شمارے میں ایک مضمون خلیل الرحمن صاحب اعظمی کی جانب سے شائع ہوا۔ ویسے تو اس قسم کی بحثیں بڑی مفید اور دلچسپ ہوتی ہیں اور ان سے بہت سی کام کی باتیں نکل آتی ہیں لیکن ان مباحثات کے فوائد بے لاگ خارجیت اور سکون دل و دماغ پر منحصر ہیں۔ جب بھی بحث میں ذاتیات اور جذباتیت سے کام لیا گیا اس کا اصلی مقصد

فوت ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی گرما گرمی ہمیں خلیل الرحمن صاحب کے مضمون میں نظر آتی ہے۔ دلائل ہمارے کچھ بھی کیوں نہ ہوں اور مقصد ہمارا تا سید ہو یا تردید لب و لہجہ کو بھی ہمارے مافی الضمیر کی ترجمانی اور وکالت میں کافی دخل ہوتا ہے اور اسی کے آثار چڑھاؤ درشتی اور نرمی پر زور اور اثر کی کمی بیشی منحصر ہے۔

خلیل الرحمن صاحب نے اپنے جواب میں ترقی پسند ادب کی مخالفت کے کل تین وجوہ بیان کئے ہیں۔ اول معاشی مصالح۔ یعنی کچھ لوگ مثلاً حسن عسکری یا حیات اللہ انصاری وغیرہ محض ذاتی اغراض کے باعث اس ادیب کی مخالفت کرنے لگے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی ملازمتیں چھین جائیں اور نہ صرف یہ بلکہ انھیں قید و بند سے بھی سابقہ پڑ جائے۔ بالفاظ دیگر یہ لوگ حکومت کے رجمان کی عکاسی کرتے ہیں۔ دوسری قسم مخالفین کی لاعلمی ہے۔ اس گروہ کے افراد یہ نہیں جانتے کہ ترقی پسندی کسے کہتے ہیں اور ترقی پسند ادب کی صحیح تعریف کیا ہے اور واقعی یہ بات اس لئے قابل تسلیم ہے کہ سوجھ بوجھ ہر ایک کا حصہ نہیں۔ ہندوستان کی اتنی بڑی آبادی میں ایسے لوگوں کا پایا جانا بھی کوئی ناممکن بات نہیں۔ تیسرا گروہ ان مخالفین کا ہے جو محض جذبات اور ہٹ دھرمی کے باعث ترقی پسند ادب کو خواہ مخواہ بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے عام اصطلاح میں لٹری بغض کہا جاتا ہے اور یہ بات بھی خدا کے بندوں سے بعید نہیں۔ اب ان تین قسموں کے آگے فاضل مقالہ نگار نے سکوت اختیار کر لیا ہے۔ جس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی اس زمانے میں جو بھی مخالفت کی جا رہی ہے وہ درخور اعتنا نہیں اور جو افراد بھی اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں ان کی باتوں میں نہ کوئی وزن ہے اور نہ ان کی کوئی وقعت۔

اس اعتراض کے باوجود کہ ترقی پسند ادب وحی والہام نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی اس کے تمام اصول برحق نہیں ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے یہاں عیب بھی ہیں اور ترقی پسند ادیب کی تخلیق کوئی بہت بڑا ادبی کارنامہ نہیں ہے وہ ترقی پسند ادب کی مخالفت میں معقولیت کے قابل نہیں ہیں، حالانکہ اپنے ہی اعتراض کی روشنی میں انکو مخالفت کی ایک چوتھی قسم معقولیت بھی رکھنا ضروری تھی۔

ان کا یہ کہنا کہ تنقید صرف ”ہاں“ یا ”نہیں“ کے اصول پر نہیں چل سکتی، بالکل صحیح ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کے اس اعلان کے بعد کہ ”مجھے صحیح ترقی پسندی پر کامل عقیدہ ہے“ ان اختلافی نکات کے اظہار پر جن سے ڈاکٹر صاحب متفق نہیں ہیں یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ترقی پسند ادب کی خوبیاں بھی گنوائیں محض بے سود ہے۔ ترقی پسندی پر عقیدہ رکھنے والے کا امور مختلف فیہ گنوانا ہی اس بات کا شاہد ہے کہ مابقی امور پر اسے اتفاق کلی حاصل ہے، لہذا ان باتوں کا اعادہ کرنا جن سے وہ متفق ہے فعل عبث ہو جاتا ہے۔

معارضین کا رجن میں ڈاکٹر احسن فاروقی بھی شامل ہیں) یہ کہنا کہ یہ ادب، ادب نہیں صحافت ہے، وقت کا اہم مسئلہ ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے اتنی آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اعتراض کو ”مدرسانہ تنقید“ کہہ کر ان کا منہ بند کرنے کی کوشش کی جائے لیکن اس خلط ممیٹ سے تو کوئی مفید نتیجہ نکلتا نہیں۔ بات جہاں کی تھاں تھی وہیں رہ جاتی ہو دیکھنا تو ہمیں یہ چاہئے کہ کیا کہا گیا ہے کہ کس نے کہا۔ وہ ڈاکٹر فاروقی ہوں یا کوئی اور غور طلب امر تو یہ ہے کہ ترقی پسند ادب پر

صحافت کا الزام ہی الزام ہے یا اس کی کوئی معقول وجہ بھی ہے۔

ادب کے نظریات کہیں بلند اور سمجہ گیر ہوتے ہیں اور صحافت کے اصول نہایت پست اور محدود۔ بقول ڈاکٹر فاروقی کے ”ادب حق نمائی اور خلوص پر مبنی ہوتا ہے اور صحافت کا مقصد ہے اپنے مخصوص نظریے (وہ ادبی ہوں، سیاسی ہوں، معاشی ہوں یا نفسیاتی) عوام میں پھیلانا“ اور اسی کو پروگنڈا کہتے ہیں۔ ادب میں کہیں ٹھوس اور پائیدار مواد ہوتا ہے اور صحافت کا مقصد ہے پروگنڈا کے ارزاں حربوں سے اپنا مقصد حاصل کرنا۔ نہایت لطیف سا فرق ہے۔ اشاعت خیال ادب میں بھی ہوتی ہے اور صحافت میں بھی بلکہ ادب اور صحافت ہی کیا انسان کی جملہ تخلیقات میں اشاعت خیال جاری و ساری رہتی ہے۔ مثال کیلئے آج کل کوئے لیجے۔ یہ شاہ جہاں کی محبت کی یادگار ہے لیکن کیا یہ اس کی محبت کی اشاعت نہیں کرتا۔ ممتاز محل کی وصیت کہ میری قبر پر ایسا مقبرہ بنوانا جو دنیا میں بے مثل ہو اسی اشاعت خیال کا اظہار کر رہی ہے۔ پھر فنون سنگتراشی و معماری وغیرہ پر غور کیجئے جن کے اصول پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ کیا ان فنون کی صنعت گری اپنے عہد اور بالخصوص اپنے صناعتوں کے خیالات کی اشاعت نہیں کرتی۔

اشاعت خیال تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اگر ذرا اور غور کیجئے تو یہ اشاعت خیال خیالات کی اشاعت ہی نہیں بلکہ بقائے ذات کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ ہر صناعت اپنی مصنوعات کے ذریعہ خود باقی رہنا چاہتا ہے۔ ہر فنکار اپنی تخلیقات کی شکل میں اپنی ذات کی بقا چاہتا ہے۔ یہ ہماری فطرت ہے اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کی شعوری کوششیں ہی کریں۔ یہ خصوصیت جو قدرت نے ہمیں ودیعت کر دی ہے لا شعوری طور پر بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ ہر انسان اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے منفرد خیالات و رجحانات ہوتے ہیں جو اس کی تخلیقات ہیں اس طرح سموئے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح جسم میں روح۔ ہر ادیب بھی عام انسان کی طرح اپنے مخصوص نظریات و عقاید رکھتا ہے۔ اس کے فن پارے انہیں نظریات و عقاید میں رچے ہوئے نکلتے ہیں اور دوسروں تک پہنچ جاتے ہیں لیکن جب کوئی اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے شعوری کوششیں کرتا ہے تو اسے ہم پروگنڈا کہتے ہیں۔ اشاعت خیال کی شعوری ولا شعوری کوششوں کو ایک سمجھنا اور دونوں طریقوں کو پروگنڈا سے تعبیر کرنا ایک صریحی مغالطہ ہے۔

ادب اور صحافت میں یہی فرق ہے کہ ادبی نظریات ہمارے تجربات کا پتھر ہوتے ہیں وہ خون صالح کی طرح حالات و تجربات کی ہضم شدہ غذا سے طیار ہوتے ہیں، خام اور غیر منہضم مواد سے حاصل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خون کی طرح ہماری رگ و پے میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے ذہن میں اس طرح بس جاتے ہیں اور ہماری ادبی تخلیقات میں اس طرح رچ کر نکلتے ہیں کہ خود ہمیں بھی ان کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ آئی و لمحاتی نہیں ہوتے بلکہ ہماری زندگی کا ایک پائیدار جزو و لاینفک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس صحافتی نظریات ہنگامی اور وقتی ہوتے ہیں۔ ان سے ہم زندگی ایک خاص مقام پر متاثر ہوتی ہے اور اس سے گزرنے کے بعد انہیں پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان کا اثر وقتی ہوتا ہے۔ وہ ہماری زندگی کا جز نہیں ہوتے۔ ان سے ہماری

زندگی مجموعی طور پر اثر پذیر نہیں ہوتی اور اسی لئے ہمیں ان کی اشاعت کے لئے شعوری کوششیں کرنا پڑتی ہیں اور اسی کو پروپگنڈا کہتے ہیں۔ چونکہ ہمیں تھوڑے سے وقت میں عوام کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرنا ہوتا ہے اس لئے ہم ان کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ پروپگنڈا کھوکھلی اور بالکل سطحی قسم کی اشاعت ہوگی۔ اشاعت خیال کی ان دونوں صورتوں (ادب اور صحافت) کے پیش نظر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ترقی پسند ادب ان میں سے کونسی صورت سے تعلق رکھتا ہے۔

”ادب برائے زندگی“ اور اشتراکیت (جو ایک عوامی تحریک ہے) کے امتزاج نے ترقی پسندی کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ ادب کو عوام کے زیادہ سے زیادہ قریب لے آیا جائے ایسی حالت میں پستی، عامیانه پن اور ابتذال کا پیدا ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ پھر یہ کہ ادب جذبات سے کھیلتا نہیں ہے بلکہ ان کو نکھارتا ہے لیکن عوامی تحریک کی حیثیت سے عوام کے زیادہ سے زیادہ قریب آنے اور ان میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہونے کے لئے ترقی پسند ادب کو عوام کے ارزاں جذبات سے کھیلتا ضروری ہو گیا۔ صحافت میں اور کیا ہوتا ہے۔ عوام کے جذبات سے کھیلا ہی تو جاتا ہے۔ ہنگامی حالات و واقعات سے ان کے جذبات کو مشتعل کر کے صرف اپنا مطلب ہی تو پورا کیا جاتا ہے۔ اپنے نظریات کی اشاعت ہی تو کی جاتی ہے اور اپنے عقاید ہی تو منوائے جاتے ہیں۔ پھر ترقی پسند ادب اور صحافت میں فرق کیا رہا۔ شعوری کوششیں دونوں میں ہوتی ہیں۔

پریم چند پرانے نظام میں اصلاح چاہتے ہیں۔ انھوں نے مقصدی ادب پیش کیا ہے۔ لیکن وہ مزدور اور کسان کا پروپیگنڈا ہرگز نہیں کرتے۔ یہ نظریات ان کی مکمل حیات میں رچے بسے ہوئے ہیں کوئی وقتی اور ہنگامی نہیں ہیں۔ وہ سماج میں اصلاح کے خواہشمند ہیں اور اس سلسلہ میں مزدور اور کسان کی ناگفتہ بہ حالت میں بھی سدھار چاہتے ہیں لیکن وہ مزدور اور کسان کی بیہودی و اصلاح کو سماجی اصلاح کے ایک لازمی عنصر کی طرح پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سماج کے مختلف شعبوں کی اصلاحات میں سے ایک اصلاح یہ بھی ہے یعنی یہ کل کا ایک جز ہے لیکن آج ترقی پسند ادب تو صرف اسی اصلاح کو مکمل اصلاح سمجھتا ہے اور بالآخر بات یہ کہ شعوری طور پر اس کی اشاعت میں سرگرم بھی ہے۔ یہ ہے مزدور اور کسان کی اصلاح اور بیہودی کے متعلق پریم چند اور ترقی پسند ادب کے نظریات کا فرق۔ پریم چند نے مزدور اور کسان کی حالت سدھارنے کے لئے وقتی طور پر ادب کو آلہ کار نہیں بنایا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جو ترقی پسند ادب عالم وجود میں آیا اس کے متعلق ہم پہلے ہی کہ چکے ہیں اب ذرا اس کی صحافتی صفات کے لئے حالیہ فسادات کے دوران میں جو ادب پیش کیا گیا اس کا بھی جائزہ لے لیجئے۔ خلیل الرحمن صاحب کا خیال کہ کچھ ترقی پسند اسی ادب کی بنا پر چراغ پا ہو گئے اور ترقی پسند ادب سے اختلاف کرنے لگے بالکل صحیح ہے لیکن انھوں نے یہ غور نہیں کیا کہ وہ جس چیز (فسادی ادب) کو ترقی پسند ادب کا مایہ ناز کارنامہ ثابت کرنا چاہتے ہیں وہی دوسروں کی نظر میں ادب کو پستی، سطحیت اور صحافت کی جانب لے جانے والا ہے۔ جسے وہ فخر ادب سمجھ رہے ہیں وہ ننگ ادب سمجھا جا رہا ہے۔

قطبنگال، ہاراگست اور فسادات کے وقتی موضوعات پر ”ان داتا“ ”پشاور ایکسپریس“ ”خونی ہے ہندوستان“

”طوائف کا خط“ وغیرہ جو کچھ لکھا گیا اس نے عوام کے دکھے ہوئے دلوں کے لئے کون سا درد ادا پیش کیا۔ اس درد کا کون سا درد ماں بچہ نیکو کیا۔ زندگی آسودگی چاہتی ہے پھر در ماندہ کچلی اور روندی ہوئی زندگی پر اس کے کون سے مفید اثرات مرتب ہوئے۔ اسکے زخموں پر اس ادب نے کون سا مرہم رکھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ لوگ ان ہولناک تباہ کاریوں کے محض تصور ہی سے کانپنے لگے۔ ان میں خوف و ہراس کا اضافہ ہو گیا اور پھر وہی انتشار و خلقتشار نا پختہ اور غیر منہضم مواد کا اخراج صحافت ہو سکتا ہے ادب نہیں کہلایا جاسکتا۔ فساد کے اثرات سے انکار نہیں۔ ادیب کا متاثر ہونا بھی فطری تھا لیکن ان اثرات کو قبول کر کے ان سے زندگی کے ارفع و اعلیٰ، جاندار، پابندہ، پختہ، پاکیزہ اور ہمہ گیر نظریات تعمیر کرنا بھی ادیب کا فرض تھا۔ ترقی پسند ادیبوں نے صرف یہ کیا کہ ماحول سے جو کچھ ملا اسے جیوں کا تیوں عوام کو داپس کر دیا۔ اب اگر ادبیت اسی کا نام ہے تو صحافت کسے کہتے ہیں۔ اس ادب کی حمایت میں دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ یہ سچی باتیں ہیں اور چونکہ ان کے تذکرے سے سرمایہ داروں کی قلعی کھلتی ہے اور انسانوں کے انسانیت سوزہ منظم اور ہیمنہ کردار پر روشنی پڑتی ہے اس لئے وہ افراد جن کے اغراض و مقاصد سرمایہ داروں سے وابستہ ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ہم اس بات کو بھی تسلیم کئے لیتے ہیں کہ چند خود غرض لوگ اس لئے اس کے مخالف بن گئے کہ اس سے ان کے اغراض و مقاصد کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہے لیکن اس سوال کا جواب پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اس ادب کا مقصد کیا تھا؟ اس سے زخمی انسانیت کی کونسی چارہ گری ہوئی؟ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ادب اپنے زمانہ کا آئینہ دار ہوتا ہے وہ عصری حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ادب آنے والی نسلیں یہ اندازہ لگا سکیں گی کہ ہندوستان میں ایک ایسا بھی دور آیا تھا جب انسانیت بہیمیت میں تبدیل ہو گئی تھی لیکن یہ کام تو مورخ کا ہے ادیب کا نہیں۔ ہنگاموں اور سوانح کا قلمبند کرنا اور روزانہ کے واقعات کو ضابطہ تحریر میں لانا صحافت نگار کا فرض ہے۔ تاریخ دار ادب پیش کرنے میں ادبیت کی کوئی شان نہیں ہوتی۔ کوئی دوامی قدر نہیں ہوتی اور کوئی اعلیٰ اور ہمہ گیر معیار نہیں ہوتا۔

بہر حال یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیب فسادات جیسے عصری حالات سے اثر پذیر ضرور ہوئے لیکن اس اثر کو جذب کر کے اور اپنے ذہنوں میں رچا کر کوئی بلند آہنگ تصورات پیش نہیں کر سکے۔ اب کھینچ تان کر اس ترقی پسند ادب کا مقصد خواہ کچھ بھی نکال لیا جائے روزنامے سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں۔

سہیل بخاری - بی۔ اے

تذکرہ مع کسرخن

(اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتا)

یہ کن اتفاق سے اس کی چند جلدیں اسٹاک میں مل گئی ہیں۔ اس لئے جن حضرات کو ضرورت ہو فوراً اطلاع دیں۔

قیمت علاوہ محصول ڈاک چار روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

کانڈ کی قوت

یہ ہے عنوان رائٹ لین کے ایک طنزیہ مقالہ کا جسے انگریزی جریدہ "The Observer" نے شائع کیا ہے۔ رائٹ لین ماسکو کے مشہور ہفتہ وار اخبار کروکوڈل کا ایڈیٹر تھا جو اپنی طنز نگاری کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتا ہے۔ حال ہی میں روس کی کمیونسٹ پارٹی نے اسے اخبار کی ایڈیٹری سے اس الزام کے ساتھ علیحدہ کر دیا ہے کہ اخبار کا انتظام اچھا نہیں ہے۔

میرا نام "سینکون نکوڈیم، پٹروویچ" ہے۔ میرے ایک جوان لڑکا ہے، ویسیا، بہت مطیع و فرمانبردار جس کی طرف سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اس کی عمر ۴ سال کی ہے۔ اگر میں اس کبھی کہتا ہوں کہ فوراً دوڑ جاؤ اور فلاں کام کر لاؤ تو وہ کبھی الٹا نہیں کرتا۔ ایک دن میں اسے ایک پبلشر کے پاس بھیجا کہ وہاں سے میرے مضمون کے معاوضہ کی رقم لے آئے۔ میں نے اسے ایک خط پبلشر کے نام کا دیا کہ "میں اپنے لڑکے واسلی سنوگون کو اجازت و اختیار دیتا ہوں کہ — وغیرہ وغیرہ۔"

جب وہ پبلشر کے پاس پہنچا تو اس نے بہت تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور بیٹھ جانے کو کہا، تھوڑی دیر بعد بولا: "تو تم کامریڈ سینکون کے بیٹے ہو؟ مجھے تم سے ملکر بڑی خوشی ہوئی" اور یہ کہہ کر اس نے میرے لڑکے کو چمک دیا اور بولا کہ "میں نے ۷۲ روپے کاٹ لئے ہیں، کیونکہ تمہارے باپ کے کوئی اولاد نہیں ہے۔"

یہ سن کر ویسیا اچھل پڑا اور بولا: "ہائیں یہ تم نے کیا کہا۔ میرے باپ کے کوئی اولاد نہیں ہے؟" پبلشر نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ "میں جانتا ہوں تمہارا باپ بے اولاد نہیں ہے، لیکن اس کا سرٹیفکیٹ کہاں ہے؟"

ویسیا نے حیرت سے پوچھا۔ "سرٹیفکیٹ! سرٹیفکیٹ کیسا؟ میں ۴ سال سے اپنے باپ کا بیٹا ہوں اور یہ تو میری شناخت کا کارڈ۔ تعجب ہے کہ میرا باپ تو اب عمر کے اس حصے سے گزر رہا جب کنوارے پن کے ٹیکس کا سوال ہی اس کے لئے پیدا نہیں ہو سکتا۔"

پبلشر بولا: "یہ سب صحیح ہے لیکن سارٹیفکیٹ کا ہونا ضروری ہے۔" ویسیا نے کہا کہ "جب میں اپنے باپ کا جیتا جاگتا بیٹا تمہارے سامنے گھڑا ہوں تو پھر سارٹیفکیٹ کی کیا ضرورت ہے؟"

پبلشر بولا "یہ درست ہے لیکن جو خط تمہارے باپ نے دیا ہے اس پر سرٹیفکیٹ کا چپکانا ضروری ہے اور افسوس ہے کہ میں تمہیں اس پر نہیں چپکا سکتا۔"

یہ تھا پہلا موقع جب مجھے کانڈ کی قوت کا پورا پورا اندازہ ہوا۔

میرے پڑوس میں ایک عورت رہتی تھی جو اپنے شوہر کی پنشن پانے کی مستحق قرار دی گئی تھی، لیکن مسلسل دو سال تک وہ پنشن کے دفتر کی خاک چھانتی رہی، لیکن اس کو پنشن نہ ملتا تھی نہ ملی۔ مجھے یہ سن کر بہت غصہ آیا اور میں نے ایک معمولی سا کاغذ لیکر اس پر پنشن افسر کو لکھا کہ ”دفتری کارروائی فوراً ختم کر کے اس کی پنشن ابھی ادا کر دی جائے۔“ اور اپنے دستخط اس طرح کئے کہ کوئی اسے صحیح نہ پڑھ سکے۔ دفتر والوں نے فوراً اس کی پنشن ادا کر دی اور کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ حکم کس کا ہے اور دستخط کرنے والا کون ہے۔ کاغذ کی قوت کی یہ دوسری مثال ہے۔

میرے ایک دوست (کریف) کا لڑکا ہے، ”نکولائی“ جو چار کے مرکزی کارخانہ میں کام کرتا ہے، یہ ذرا مسخرا بھی ہے۔ اسکا ایک واقعہ سنئے:۔ چونکہ اسے قازان سے دفتر تک ریل پر روز آنا جانا پڑتا تھا، اس لئے اس نے چاہا کہ ریل کا سیزن ٹکٹ لے لے، چنانچہ وہ ٹکٹ گھر گیا اور اپنی تصویر دیکر کہا کہ ”اس تصویر والے کو سیزن ٹکٹ دیدو۔“ کھڑکی پر ایک خاتون کام کر رہی تھی، اس نے تصویر دیکھ کر بہت مختصر سا جواب دیا کہ ”نہیں مل سکتا۔“

نکولائی نے پوچھا ”کیوں“ تو اس نے جواب دیا کہ ”تصویر کے ساتھ وہاں کا سرٹیفکٹ ہونا چاہئے جہاں تم کام کرتے ہو۔“ اس نے پوچھا کہ ”سرٹیفکٹ کس بات کا ہونا چاہئے“، وہ بولی ”اس بات کا کہ یہ تصویر تمہاری ہی ہے۔“ اس نے کہا کہ ”میں خود تمہارے سامنے موجود ہوں، تم ہی اس تصویر کو میری صورت سے ملا کر سرٹیفکٹ دیدو“ وہ بولی ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

یہ سنکر نکولائی گھر چلا گیا اور وہاں کسی پرانے اخبار سے جنرل اسکو بلف کی تصویر (جس میں اسکی نوکدار داڑھی اور اسکے کوٹ کے تمنے بھی نمایاں تھے) کاٹ کر ایک دفنی پر چپکائی اور اس کی پشت پر لکھ دیا کہ ”میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ تصویر کریف کی ہے“ اور کوپک سے لیکر اس پر ہلکی سی روشنائی لگائی اور اس کی مٹی مٹی سی گھر لگا دی۔ یہ سب اس نے اس لئے کیا تھا کہ جب اس تصدیق کا کو لیکر وہ اسٹیشن کی کھڑکی پر جائے گا تو وہ خاتون اور بگڑے گی اور تھوڑی دیر کی دل لگی رہے گی، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اس تصویر پر اس کو سیزن ٹکٹ دیدیا اور گرمی بھر وہ اس ٹکٹ سے سفر کرتا رہا۔ جب ٹکٹ انسپکٹر اس تصویر کو دیکھتا تو اسی کے ساتھ نکولائی کو تو وہ بہت گھبراتا لیکن جب وہ ہر شے تصدیق دیکھتا تو خاموش رہ جاتا۔ دیکھی آپنے کاغذ کی قوت۔

کچھ عرصہ ہوا میں ایک سرکاری ادارہ میں جانا چاہتا تھا، لیکن اندر جانے کے لئے پاس کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑھا شخص خاکی وردی میں بیٹھا ہوا ہے اور ہر شخص سے جو پاس مانگتا ہے، صرف اتنا کہہ دیتا ہے ”ع۔ م۔ ج۔“ اور جب وہ اس کا مطلب نہ سمجھ کر پھر پاس مانگتا ہے تو وہ پھر وہی حروف دہرا دیتا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ ”یہ تم کہتے کیا ہو۔“ بڑھے نے بگڑ کر کہا کہ ”تم روسی زبان اتنی بھی نہیں جانتے، ان حروف سے مراد ہے ”عرفی نام، مسیحی نام اور جدی نام۔“ جب میری باری آئی اور میں نے اپنا کارڈ دکھاتے کیلئے جیب ٹٹولی تو موجود نہ تھا، میں نے کہا کہ ”اپنا شناخت کا کارڈ تو میں گھر بھول آیا ہوں۔“ اس نے کہا کوئی حرج نہیں، ”کوئی کاغذ کسی قسم کا دیدو۔“ اتفاق سے میری جیب میں ڈاکٹر کی دی ہوئی رپورٹ تھی جو اس نے میرا پیشاب جانچنے کے بعد دی تھی۔ میں نے وہی اس کے سامنے رکھ دی اور اسے کہا ”ٹھیک ہے۔ ع۔ م۔ ج۔“ اور مجھے پاس دیدیا۔ یہ ہے روس میں کاغذ کی قوت کا حال!

مشہور شاعر، گمنام غزل گو

میں آج جس شاعر پر لکھنے بیٹھا ہوں اس کا تعارف کراتے وقت ایک عجیب کشمکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تعارف اس کا کرایا جاتا ہے جسے لوگ نہ جانتے ہوں لیکن یہاں تو عجیب بات یہ ہے کہ لوگ اسے جانتے بھی ہیں اور نہیں بھی جانتے۔ آج سے سو برس پہلے غالب نے اپنے متعلق کہا تھا کہ میرا اصل کارنامہ فارسی شاعری ہے، لیکن کسے معلوم تھا کہ ایک زمانہ میں جو چیز انھیں زندہ رکھے گی وہ وہی ”مجموعہ اردو“ ہو گا جس کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں تھی۔ آج کچھ ایسا ہی معاملہ میرے ساتھ بھی آن پڑا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ”صحیفہ تجلی“، ”عہد اسیری“، ”معرکہ غم“ اور ”منظر درد“ کا مصنف اصل معنوں میں ایک مرثیہ نگار یا قصیدہ گو نہیں بلکہ ایک غزل گو ہے اور اسی دنیا میں اس کی شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں، تو آپ تو الگ رہے خود مصنف بھی مجھ سے اختلاف کرے گا لیکن کیا کیجئے آج حقیقت مجھے اُکسا رہی ہے کہ میں اس ”پردہ زنگاری“ کو چاک کرنے کی جرأت کروں اور آپ کو یہ دکھاؤں کہ وہی رزم رد و لوسی جسے ایک مخصوص طبقے میں ”شبیر کی مداحی“ کا تنہا امین سمجھا جاتا ہے وہ میر تقی میر، خلیق، انیس اور عروج وغیرہ کے سلسلہ کی ایک کڑی نہیں ہے بلکہ جنگ عظیم کے بعد اردو غزل میں ایک نئی نسل کے پیدا ہونے کے امکانات جن شعراء کی تخلیقات میں ملتے ہیں رزم بھی اسی گروہ کا ایک فرد ہے۔ اس کا نام ہمیں یگانہ اور فراق کے ساتھ لینا چاہئے۔ اگرچہ یگانہ اور فراق نے نئی نسل کو بہت متاثر کیا ہے اور رزم کی غزلوں سے آج دنیا واقف ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ خود شاعر اپنے مرثیوں اور قصیدوں کو ”نقش ہائے رنگ رنگ“ سمجھ کر منظر عام پر لاتا رہا اور اس کی وہ غزلیں جن میں زندگی کی نئی طاقت اور حیات انسانی کا پورا کس بل موجود ہے وہ اس کی نظر میں ”باز رنگ مست“ رہیں اور ایک قلمی بیاض میں مدفون۔ کبھی کبھی دل پہلاؤ کی خاطر یہ آواز مشاعروں میں گونجی لیکن پھر فضا میں غائب ہو گئی۔ رزم کی شخصیت کو تلاش کرنا ہے تو ان کی غزلیں پڑھئے۔ ان کی یہ شاعری اپنے درد کے ذریعہ تمام کائنات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک نیا سوز، ایک نئی لے اور ایک ایسا آہنگ ہے جس میں زندگی کا دلولہ، آگے بڑھنے کی قوت اور ایک آفاقی کلچر کے عناصر سموئے ہوئے ہیں۔

ہر چیز چھپا یا ہے انداز جنوں میرا ہر شے میں مجھے اپنی تصویر نظر آئی

رزم کی اس آواز کا رشتہ دور کی اس آواز سے جوڑیے جب تمیر کو زندگی کی مجبوریاں ”بہار کی زلفوں“ کو بھی ”زنجیر“ سمجھنے پر مجبور کرتی تھیں۔ رزم کی شاعری میں اس دور کا عکس ہے جب زندگی مجبوریوں کے سامنے سر نہیں جھکاتی بلکہ

اس کے مقابل اپنے پورے زور اور طاقت کے ساتھ نبرد آزمائی کرنے کو طیار ہے یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری ہمیں روحانیت کی طرف نہیں لے جاتی، زندگی کی تلخیوں کو بھلا کر موت کے دامن میں پناہ لینے کا راستہ نہیں بتاتی بلکہ زمین کی خوبصورتی اور زندگی کی کشش راہوں سے گزر کر منزل تک پہنچنے کی دعوت دیتی ہے۔

خدا معلوم ان ذروں میں کتنے دل دھڑکتے ہیں
زمین پر بسنے والے کچھ سمجھتے ہیں زبان دل کی
عشق میں دراصل جینا ہی کمالِ ذوق ہے
زندگی مشکل ہے مرنے کا کوئی مشکل نہیں

جینے کی یہ آرزو اور دل کی زبان میں زمین پر بسنے والوں تک ذروں کے دل کی دھڑکن کا پہونچانا نئے دور کی نئی طاقت اور نئی امنگ کا ایک فنکارانہ اظہار ہے جو ہر اس نوجوان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو زندگی میں حرکت اور ارتقاء کو ضروری سمجھ کر ایک بہتر جہان کی آرزو میں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

جعفر جہدی رزم کی عمر اس وقت تقریباً پچاس سال ہے۔ وہ اودھ کے ایک قصبہ ردوتی میں پیدا ہوئے جو لکھنؤ اور فیض آباد کے درمیان واقع ہے۔ ان کی شاعری کا آغاز روایتی طریقے سے ہوتا ہے۔ ابتدا میں نجم افندی اکبر آبادی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کی شاعری میں نہ تو استاد کا رنگ چھلکتا ہے اور نہ اس زمانہ کے مقبول عام شعراء کا۔ حالانکہ رزم نے ان مشاعروں میں ہمیشہ شرکت کی ہے جس میں عزیز لکھنوی، حسرت، قانی، صفی، اصغر، آرزو اور جگر مراد آبادی گھٹا بن کر چپائے رہتے تھے۔ ان کے یہاں غیر شعوری طور پر ابتدا ہی سے وہ رنگ ملتا ہے جو ان اساتذہ کی ڈگر سے بہت کر "آیات وجدانی" کے مصنف کے یہاں پایا جاتا ہے اور جو اس زمانے میں "گرم مسالے" والے ادبی حلقوں میں ناپسند بھی کیا جاتا تھا۔ رزم کی شاعری میں یہ رنگ کیوں آیا۔ اس کے لئے ہمیں اس ماحول کو دیکھنا ہوگا جہاں ان کی پیدائش ہوئی۔ ردوتی میں اگرچہ وہی زبان بولی جاتی ہے جو لکھنؤ کے شرفا کی خاص زبان ہے اور وہاں کے ادیب و اہل قلم بھی خود کو لکھنؤ اسکول سے متعلق سمجھتے ہیں اور ان پر انیس و آتش کا گہرا اثر ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ لکھنؤ کے سیاسی حالات کا اثر ان قصبات اور چھوٹے چھوٹے شہروں پر براہ راست نہیں پڑا۔ ۱۹۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں حکومت کے بدلنے کے ساتھ ہی پُرانی تہذیب اور پُرانے نظام کی طنز ہیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس فضا میں دو گروہ ملے ہیں ایک وہ جنہوں نے یکسر نیا نا جامہ اتار پھینکا اور لندن کی آتی ہوئی بہار دیکھ کر وہ عہد و فاجہ بھول گئے جو حب علی بیگ سرور نے کسی زمانہ میں کیا تھا۔ دوسرا گروہ قدامت پرستوں کا تھا۔ انہوں نے انحطاط اور قنوطیت کے دامن میں پناہ لی۔ زندگی کے ہرے اب شطرنج کے ہرے بن چکے تھے اور جوانی کی امنگوں کا نشہ ایفون کی فضا میں تحلیل ہونے لگا تھا، امانت کی اندر سجا کہیں آسمان میں آنسوؤں کے سائے پر رقص کر رہی تھی اور دم توڑتی ہوئی تہذیب کی یہ آخری جدوجہد بھی ختم ہو کر اب جیسے ایک سمی اتھ، نالہ و شیون اور فاتحہ خوانی کی سہی کیفیت رہ گئی۔ اردو شاعری کا یہ دور لکھنؤ میں اسی بے جان منظر کی یاد دلاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی خود لکھنؤ کے آس پاس اودھ کے قصبوں میں اس انقلاب کا ایک اور رد عمل ہوا۔ یہ اپنی تہذیب کی محبت اور

اس کے ساتھ ساتھ نئے دور میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے کا مسئلہ تھا۔ نوجوانوں کا یہ گروہ اگرچہ اسی طبقہ سے اٹھا تھا جس کی روایات پر ایک زوال طاری تھا لیکن اس طبقے سے جو نوجوان اُٹھے وہ نہ تو نئی رو میں بہ گئے اور نہ قدامت کو سینے سے لپٹائے رکھا۔ اپنی تہذیب اور قدیم معاشرت کو برقرار رکھنے کا جذبہ بھی تھا لیکن زندگی کو سنوارنے اور آگے بڑھنے کی لگن بھی تھی۔ لکھنؤ اسکول نے اپنے آخری دور میں عزیز، ثاقب اور آخر وغیرہ کو پیدا کیا جن کے یہاں زبان و بیان کی خوبیوں کے باوجود انحطاط و اضمحلال اور منفی رجحانات ملتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کا یہ ردِ عمل ہمیں پنڈت برج نرائن چکبست، نوبت رائے نظر اور جوش ملیح آبادی وغیرہ سے روشناس کراتا ہے۔ یہ شاعر اپنے اندر انیس و آتش کی تہذیبی روایات کے ساتھ نئے دور کا بیجا لیکر آئے۔ رزم اسی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعد میں شاد عظیم آبادی کے شاگرد میرزا یاس بگاہ لکھنؤ پہنچتے ہیں اور غزل کے ایک نئے مدرسہ فکر کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

رزم کی ابتدائی غزلوں میں اگرچہ لب و لہجہ سیت کچھ اس زمانہ کے غزل گو یوں سے ملتا جلتا ہے لیکن خیالات میں کس طرح وہ عزیز لکھنوی، خانی اور جگر وغیرہ سے اپنا دامن بچا لیتا ہے وہ ان اشعار میں دیکھئے:-

رنگ بدلائے زمانے کے	چند چلے مرے خسانے کے
ہو سکے کب حریفِ آزادی	درو دیوار قید خانے کے
اب کہاں لیجائے قسمت یہ قناعت دیکھ کر	دیکھے کیا ہو قفس کے آشیاں ہونے کے بعد
یہ لالہ زار مقتل، یہ ہوائے دامن قاتل،	سکوں سائل رہا ہے، نیند سی معلوم ہوتی ہے
اور ہوتی جو کوئی صورتِ عشق	کیوں گنہ گار زندگی ہوتے
فقط اک حجابِ نظر رہ گیا ہے	بس اب اک نفس شعلہ زرا چاہتا ہوں
میں اپنے ہی جلوؤں کی تابانیوں میں	تجھے دیکھ کر گم ہوا چاہتا ہوں
وعدہ ترا سچا ہے مری زلیست کا کیا ٹھیک	آج کل زمانہ کہیں جھوٹا نہ بنا دے
زندگی عشق اور عشق بقیں،	موت و ہم اور گمان ہے پیارے
تیرے پا مالِ غم کی خاکِ دل	آسمان آسمان ہے پیارے

خیر یہ تو اس وقت کی باتیں تھیں جب رزم کی ذہنی مشق کا دور تھا۔ اس وقت ہر شاعر مختلف وادیوں میں بھٹکتا رہتا ہی بہت سی آرزوئیں اور خواہشوں کو دوسروں کی آرزوئیں اور خواہشوں کو دیکھ کر جنم دیتا ہے لیکن جب وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کی راہ کے حادثات بالکل نئے ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی راہ بالکل الگ ہو جاتی ہے۔ اس نے بات کرنے کا ڈھنگ اور جذبات کے ناپنے کا جو بیجا مقرر کیا تھا وہ اس کی زندگی کے مختلف رنگوں میں رنگ کر ایک اور ہی چیز بن جاتا ہی اس دور کے بعد رزم کی شاعری میں عشق کا نیا تصور اور زندگی کا نیا نظریہ جگ لے لیتا ہے۔

رزم کی عشقیہ شاعری کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں حسن و جمال کے لطیف احساس کے ساتھ عشق کا ایک بلند تصور بھی ملتا ہے۔ وہ عشق کو صرف ایک انفرادی چیز نہیں سمجھتے اور نہ ان کا محدود کہ دل کے خون کرنے کی فرصت کے لئے یہ ایک طرح کا مشغلہ ہو۔ بلکہ انسان کو انسان بننے کے لئے ان کے نزدیک عشق بہت ضروری چیز ہے۔

بے عشق درد زلیت کا دریاں نہ ہو سکا انسان بجائے خود کبھی انسان نہ ہو سکا

رزم کا عشق چونکہ زندگی اور اس کی جدوجہد کی ایک علامت ہے اس لئے اس میں ایک ربط، ایک تسلسل اور حیات کا ایک منظم خاکہ ملتا ہے۔ ان کی غزلیں شروع سے آخر تک پڑھ جائیں۔ شاعر کی شخصیت آپ کے سامنے واضح ہوتی جائے گی۔ یہ شخصیت ابتدا میں انفرادیت لئے ہوئے ہے۔ اپنے دل کے احساسات، اپنے عزم اور عصلے کا اندازہ اور اس طاقت کے باوجود ایک تشنگی، ادھورا پن اور خلا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے وہ کسی بہت سے قریب ہوئے کی آرزو رکھتا ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کھو کر اپنے وجود اور اپنے دل کی کل کائنات کو کسی کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہے، کسی کو اپنا بنانے اور کسی کو پالنے کی خواہش کے بعد خلوص کی منزل آتی ہے۔ یہاں خود پرستی اور اٹائیت کا قاتمہ ہو جاتا ہے۔ اب زنجیر کی دوسری کڑی جو شروع ہوتی ہے وہ اس خواہش کی تکمیل میں مختلف منزلوں سے گزرنے کی ہے۔ یہیں پہونچ کر شاعر اپنی انفرادیت کو چھوڑ کر اجتماعیت کی طرف آ جاتا ہے۔ یہیں اس کا عشق، اس کی جدوجہد، منزل تک پہونچنے کی کوشش پوری زندگی کے مترادف بن جاتی ہے۔ چونکہ یہ حلقہ اور احساس عام انسانوں میں مشترک ہے اس لئے ایک شاعر کی آواز کو آپ اپنی آواز سمجھنے لگتے ہیں اور ایک شخص واحد کی کہانی ”روداد جہاں“ معلوم ہونے لگتی ہے۔

جوانی کی ابتدائی منزل میں جب وہ قربت کے احساس اور جستجو کے دور سے گزرتا ہے اس وقت کے جذبات جمالیاتی حس اور رنگینی و رعنائی کا تصور پوری طرح دل و دماغ پر مسلط رہتا ہے۔

نصا میں گرمی انفاس ہے سرور انگیز چلے گئے وہ مگر اب بھی ایک عالم ہے اور ”گرمی انفاس“ کا یہی سرور اسے ایسے نشے میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ اپنے دل کی ہر دھڑکن اور اپنے درد کی ہر کسک میں حس کی قربت محسوس کرتا ہے۔

یہ بخودی کا ہے عالم کہ ایک قرب تمام میں بڑھ رہا ہوں کہ نزدیک آ رہا ہے کوئی
ہر ایک درد کی کڑی پہ اٹھ رہے ہیں حجاب ہر ایک سانس میں پیغام پار رہا ہے کوئی
ہے کس خیال میں کم شکہ سنج درد فراق حجاب غم تو اٹھا مسکرا رہا ہے کوئی

لیکن اس ابتدائی منزل سے گزرنے کے بعد اس کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں پوری طرح سامنے آ جاتی ہیں اس منزل میں اسے خود کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ خوشی اور غم دونوں تجربوں کی تصویر اپنی حقیقت کے ساتھ آتی ہے۔ اب خوشی صرف آرزو کی خوشی نہیں اور غم صرف ایسا غم نہیں جو دل کے ایک ہلکے سے احساس اور ذہن کی ایک معمولی سی سوچ کے

بعد پیدا ہو جاتا ہے بلکہ وہ خوشی ایسی ہوتی ہے جو بہت سی تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد آتی ہے لیکن جب آتی ہے تو دل و دماغ کو مکمل طور پر بالیدگی بخشی ہے۔ وہ غم ایسا غم ہے جو آتا ہے تو احساسات کے تمام تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیتا ہے جو انسان کے لئے ایک کرب مسلسل، ایک ہڈیوں کو پگھلا دینے والا روگ بن جاتا ہے۔ اس دنیا میں پہونچ کر شاعر زندگی سے قریب ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کا ذرہ ذرہ، اس کے بھرے ہوئے مناظر، یہاں کے دن رات، قفس و آشیاں، شمع و فانوس ایک گہرے تجربے کی عکاسی کرتے ہیں۔ رزم کی شاعری اس دور میں زندگی کی شاعری ہو جاتی ہے۔ اس دادی میں دلہنی زندگی کو کھوکھلے اصل میں زندگی کو پالیتا ہے۔

جرمِ اُلفت کا سہارا ملتے ہی ہوش آگیا عالم اسباب میں کھویا ہوا اب دل نہیں
بلکہ یہ جستجو، یہ جدوجہد اور راہ کی صعوبتیں اس میں موت کی آرزو کے بجائے زندہ رہنے کی خواہش اور جینے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری میں درد و غم، افسردگی اور ادا سنی لئے ہوئے بھی رجائیت کی کرن جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان میں واقعات کا تسلسل المیہ انداز میں ہو لیکن لب و لہجہ کا تاثر تو اتنا فی اور کس بل لئے ہوئے ہے اسکا اختتام نشاط کی کیفیت بھر دیتا ہے اور انسان اپنی تھکن اور شکست کے باوجود پھر ایک بار لڑنے کے لئے پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ طیار ہو جاتا ہے۔ لب و لہجہ کا یہ تاثر ان اشعار کو پڑھتے ہوئے اپنے دل میں محسوس کیجئے۔

ہم اہل ظن گوارا یہ عار کیا کرتے	شکایت ستم روزگار کیا کرتے
خرد کے ہاتھوں حجاب مجاز اٹھ نہ سکا	جو مست کرنے سکے ہوشیار کیا کرتے
چمن میں آگ لگا دی دلوں کو بھونک دیا	بچل کے اور یہ ابر ببار کیا کرتے
قرار نام فنا، اضطراب نام بہت	خراب زلیست تلاش قرار کیا کرتے
سریم ناز کا پردہ اٹھانے کے ہم سوئے	دُعائے نیم شبی کا فقط بہانا تھا
میں اور کیا کہوں ان کی جفا کے پیہم کو	مری وفا کا فقط حوصلہ بڑھانا تھا
بس ایک جہد مسلسل کا نام ہے ہستی	کبھی جو بر نہیں آتا وہ مدعا ہوں میں
میں دلیل زندگی سمجھوں کہ امید وصال	شمع اک کبھتی ہوئی سی دل کے کاشانے میں ہے
جھلک یوں پاس میں امید کی معلوم ہوتی ہے	کہ جیسے دور سے اک روشنی معلوم ہوتی ہے
مبارک زندگی کے واسطے دنیا کو مرٹنا	ہمیں تو موت میں بھی زندگی معلوم ہوتی ہے
یہی ہے صبا کی جو نکہت فروشی	قفس لیکے اب میں اڑا جا ہوتا ہوں
اے باد صبا چھڑ نہ خاکستر دل کو	ہر ذرہ کہیں پھیل کے صحرانہ بنائی
تیرے شایانِ لطف دل نہ سہی	حوصلے تو ہیں غم اٹھانے کے

نگاہ اہل تماشا نہیں ملنے کی
 ابھی ہوا میں پریشاں غبار باقی ہے
 ان اشعار کے پڑھنے سے شاعر کی جو شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے وہ جہاں نئے دور کے انتشار اور بحران کی تعمیر کے
 وہاں اس شخصیت کے اندر یہیں نیا خون بھی ملتا ہے۔ نئے دور کی امنگوں کے ساتھ مستقبل کا حسین خواب اور اس خواب
 کی تعبیر کی جستجو، دنیا کے ان تمام اجزاء اور قوت پیدا کرنے والی اشیاء کا مطالعہ کر کے اپنی طاقت کا اندازہ کرنا اور ایک فرد کا
 رشتہ جمہور سے جوڑنا۔ یہی شاعر کی وہ حسرت پر واز ہے جو اپنی شکستہ حالی کے باوجود قفس لیکر اڑنا چاہتی ہے۔ اس کا
 ہر ہر قدم اب بتاتا ہے کہ وہ لغزشوں پر پوری طرح قابو پا چکا ہے اور راہ کی دشواریوں سے آشنا ہو چکا ہے۔ دوسرے
 دور میں وہ اپنی عشقیہ شاعری کے ذریعہ مادے کی مختلف قوتوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ تیر کی طرح وہ زندگی سے مایوس نہیں ہے
 اور نہ ذوق کی طرح اس کے دماغ پر یہ ہراس مسلط ہے کہ ”مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے“ رزم کو دنیا کے آلام
 زندگی کی وسعت سے آشنا کر دیتے ہیں۔ جینے کی خواہش، آگے بڑھنے کا ولولہ، زندگی کو سنوارنے کا جذبہ ان کے تمام خیالات
 پر چھا جاتا ہے۔ زندگی کا یہ صحت مند نظریہ اردو شاعری کی نئی نسل کا بہت بڑا اکتساب ہے۔ رزم کے ان اشعار کو پڑھئے تو
 آپ کو اس میں نئی زندگی کی نئی طاقت کا احساس ہوگا۔

ہے مری نا چیز ہستی بھرنا پیدا کنار
 موت کہتے ہیں جسے وہ زیت کا ساحل نہیں
 حسن نظر سے میں نے سنواری جو کائنات
 وہ کون خار تھا کہ گلستاں نہ ہو سکا
 یہ حوصلہ ہے کہ بجلی کی زد پہ گلشن میں
 ہر اہتمام نشیمن بنا رہا ہے کوئی
 کہاں یہ قطرہ خوں اور کہاں الی کا غم فرقت
 کھلا ہیں مجھ پہ دل کی وسعتیں و برد آشنا ہو کر
 ہم بخود ہی و ہوش کی حد سے گزر کے بھی
 اندازہ جمال حقیقت نہ کر سکے
 تکمیل عشق قید میں مجبوریوں کے تھی
 کیسی ہنسی کہ رونے کی جرأت نہ کر سکے
 اک نئی دنیا سجاتا ہے مرا روشن ضمیر
 میں بہل جاتا ہوں جب لے رزم گھبراتا ہے دل
 تھا مرا پہلا قدم باہر حد ادراک سے
 کون کہتا ہے مجھے اندازہ منزل نہیں
 ذرا لے شوق منزل رہزن غم کی خبر کھنا
 امیدیں بڑھ رہی ہیں کارواں درکارواں کی

رزم کی عشقیہ شاعری کی امتیازی خصوصیت صرف یہی نہیں ہے کہ اس میں زندگی کا صحت مند رخ ملتا ہے بلکہ ان کے یہاں
 ”روح عصر“ جس انداز میں ملتی ہے وہ نئی غزل میں بہت کم ملے گی۔ شاعر ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات سے متاثر
 ہو کر جذبات کی رو میں شور نہیں مچانے لگتا اور نہ کسی قسم کی ”نعرہ بازی“ کا سہارا لیتا ہے، بلکہ یہاں بھی اس کا فن اپنے نقطہ
 عروج پر نظر آتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ سیاسی خیالات کے اظہار کے لئے غزل مرے سے موزوں ہے ہی نہیں
 لیکن میرا خیال ہے ایسا کہہ کر اس کی رمزیت اور ایمائیت سے انکار کرنا ہے۔ ایک بڑے سے بڑا فنکار کسی جذبے کو موثر بنانے

کے لئے اسے بالکل اسی رنگ میں نہیں پیش کر دیتا بلکہ اشاریت کا سہارا لیتا ہے اور اسے ایک مکمل اور بھرپور وار کی صورت میں پیش کرتا ہے "آشیاں اُجڑا کیا، ہم ناتواں دیکھا کئے" کہہ کر اپنی مجبوری اور بے بسی کا جو اظہار ہو سکتا ہے وہ سیکڑوں طریقے سے اپنی بربادی کی داستان بیان کرنے پر بھی مکمل نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ تیرے لیکر فراقی تک ہر شاعر نے اسی "تنگنائے" کے ذریعہ اور اسی گل و بلبل اور قفس و آشیاں کی علامتوں کے ساتھ اپنے دور کی پوری ترجمانی کی ہے۔ اس میں کامیابی یا ناکامی کی ذمہ دار غزل کی تکنیک نہیں بلکہ شاعر کا شعور ہے۔ شاعر کا شعور جتنا بیدار ہوگا اتنا ہی مکمل طریقے پر اس کے یہاں "روحِ عصر" ملے گی۔

رزم کی شاعری کا آغاز ہی اس وقت ہوتا ہے جب ہندوستان ایک سیاسی انتشار کے دور سے گزر رہا ہوتا تھا۔ جنگِ عظیم میں ہندوستانیوں نے جن شرائط پر سرکارِ برطانیہ کی مدد کی تھی ان کے نتائج نے مایوسی کے بجائے غم و غصہ پیدا کر دیا تھا۔ جلیان والا باغ کا حادثہ، تحریکِ خلافت، گول میز کانفرنس کا انجام۔ یہ تمام چیزیں اس زمانہ میں شاعر کے احساسات پر حاوی نظر آتی ہیں۔ رہنما عوام کو بیدار کرنے کے لئے سیاسی صور پھونک رہے تھے لیکن اس کی آواز بے جا کسی نظر آتی تھی آزادی کی آرزو تھی لیکن آزادی کا تصور واضح نہیں تھا۔ کبھی یہ گھٹ کر ہوم رول اور وزارتوں تک آجاتا تھا اور کبھی جب رہنما چونک اُٹھتے تھے تو انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے خواب بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس وقت سیاسی تحریکوں میں ایک طرح کی شکست خوردگی کا جذبہ ملتا ہے۔ اس زمانہ میں رزم کی غزلوں میں یہ رنگ دیکھئے:-

مری مجبوریوں کا نام رکھ لو دوسری دُنیا	یہ کوئی فاصلہ جو قفس سے آشیاں تک ہے
ابھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے کارواں اپنا	ابھی لپٹی ہوئی دامن سے گرد کارواں تک ہے
دلہن گے ایک کروٹ غم کی راتیں کاٹنے والے	یہ سب بیداریوں کی دھوم اک خواب گراں تک ہے
نشین جل چکا تھا جب قفس تک پہنچ آئی ہے	اسیرانِ ستم ہمدردی صیاد کیا کرتے
نکاپیں رہ گئیں ٹکڑے بام و در سے زنداں کے	بحد ذوق سیرِ عالم ایجاد کیا کرتے
قفس ہی آشیاں ہے ایک مدت کے اسیروں کو	کہاں سر پھوڑنے جائیں گے یہ قیدی رہا ہو کر
ہاتھ اُن کا بٹالیں جو رہو وہ کہاں پیدا	کیوں بار گراں لیکر یہ راہبر آئے ہیں
اس دورا ہے سے نکال لے ذوقِ آزادی مجھے	زندگی ہے تلخ قیدِ کلفت و آرام سے

رزم کی یہ آرزو پوری ہوتی ہے اور ہندوستان کا نوجوان اس دورا ہے سے نکل کر آزادی کا واضح تصور اور مکمل انقلاب کی تحریک ساتھ لیکر بڑھتا ہے۔ اب اس میں ہمت ہے اور قربانی کا جذبہ۔ وہ آزادی کی دیوی سے ہمکنار ہونے کے لئے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لئے بھی طیار ہے۔ ہندوستان میں غلامی کے شدید احساس نے آزادی کے حصول کی جو امنگ پیدا کی تھی اس نے ایک حد تک ان رہنماؤں کو نقصان بھی پہنچایا جو ہمیشہ صبر و ضبط کی تلقین کرتے رہے

اور یہ سبق دیتے رہے کہ ایک روز خود بخود ”نجات“ حاصل ہو جائے گی لیکن یہ مواد یک چکا تھا اور ۱۹۶۷ء میں اس ضبط و احتیاط کا عوام کے اندر ایک زبردست رد عمل ہوا۔

ہر اک نفس ن تڑپا ہے ہر اک نظر مبیاک
کسی خطر سے جھجھکنا شباب کیا جانے
سنبھالیں نظم وفا کو تمام دل والے
بنے کہ بگڑے جہاں انقلاب کیا جانے
نظر فریب سہی احتیاط کی دُنیا
یہ سست گامیاں جوش شباب کیا جانے

آخری شعر سے شاعر کا نقطہ نظر صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان جماعتوں سے الگ ہے جن کا خیال ہے کہ آزادی ایک نہ ایک دن خود بخود آجائے گی اور اس شعر میں تو یہ تصور اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

رہائی اعتماد ذاتی و توفیق سے پائی
کیا تھا قید جن ہاتھوں نے وہ آزاد کیا کرتے

اور رزم کی شاعری کا وہ حصہ خاص طور پر قابل توجہ ہے جب ہم آزاد ہو کر بھی صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہوئے اور ہماری منزل ایک سراب ثابت ہوتی ہے۔ آزادی کے متوالوں کا یہ حال ہے کہ:

لطف آزادی کجا، رک رک کے ٹٹتے ہیں قدم
یاد ہیں وہ دن ابھی جب پاؤں میں زنجیر تھی

یہ آزادی چند افراد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ عوام اسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں بلکہ ان نئے حکمرانوں نے ان کے خیال اور عمل پر اور بھی پابندیاں لگا دیں۔ آزادی کے پجاریوں کی یہ شکست موجودہ دور کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ رزم اس کارواں کو دوبارہ اٹھنے کا پیغام دیتا ہے اور نوجوانوں سے کہتا ہے:-

فکر آزادی کو تا احساس امکاں کیجئے
دل سے دل تک برق خود داری کو جلاں کیجئے

دامن گل میں فروزاں کیجئے آتش کدہ
آگ کے شعلوں سے ترتیب گلستاں کیجئے

یہ ستم ہائے مسلسل، یہ جفائے متصل
لایئے کس کی زباں جو شکرا احساں کیجئے

حیرت غم تا کجا ضبطِ محبت تا بے
رزم اٹھئے اب سکونِ غم کو طوفاں کیجئے

تختِ بے حجاب ہے اور ذہن بے نقاب
نگہرا ہوا حیات کا جو ہر ہے آج کل

پیکے ہوئے قدم ہیں سر منزلِ صیب
رہو خود اپنے شوق کا رہبر ہے آج کل

مایوسیوں کا سرد وسیہ دور اب کہاں
ہر گوشہ خیال منور ہے آج کل

کیا شانِ التفات ہے پاک امتیاز سے
ہر رند میکدے میں برابر ہے آج کل

آواز دے رہا ہے مرا میکدہ مجھے
میری طلب میں قرب ساغر ہے آج کل

موجودہ دور کی غزلوں میں رزم کے یہاں فنی تکمیل کے احساس کے ساتھ ایک نگہرا ہوا رنگ ملتا ہے۔ ان کی شاعری مختلف منزلوں سے گزر کر اب ایک خاص مقام کی تعیین کرتی ہے۔ اس میں کہیں خامی یا کچا پن نہیں ہے بلکہ جو بات

کہی گئی ہے وہ ایک کمل آہنگ کے ساتھ۔ یہ دور چونکہ پاس وافر دگی اور غم و اندوہ سے نکل کر حوصلہ انگ اور جہور کی بڑھتی ہوئی زندگی کا ہے اس لئے شاعر کے لب و لہجے میں بچائے لکھی کے ایک طرح کی جھنکار ہے۔ اس میں نئے اشارے اور سوچنے کے نئے نئے انداز ملتے ہیں۔ رزم کا عشق اب زندگی کی روانی بھی ہے اور تاریخ کے بدلتے ہوئے نقشوں، سیاست کے نئے سانچوں اور ماحول و وقت کی رفتار کا ایک بہترین امتزاج بھی۔ ان غزلوں میں انداز بیان، تشبیہیں، ترنم و موسیقیت اس دور کی رواں دواں زندگی کے مظہر ہیں۔ عشقیہ شاعری کی اس نئی شراب میں رنگینی و سرستی بھی ہے اور نشے کی ایسی تند لہر جس میں بیداری کی روح ہوتی ہے۔

سمجھ سکی نہ جو رعنائی نقاب کا رخ
وہ آنکھ جلوہ زیر نقاب کیا جانے
شکستہ دل کے تقرب کا کیا ٹھکانا ہے
مقام غم کو کوئی کامیاب کیا جانے
جسے نہ دی ہو محبت نے حیرت جلوہ
وہ جاگتی ہوئی آنکھوں کا خواب کیا جانے
وہ بد نصیب رہا جو سکون عیش میں غرق
بہار زلیست کو بے اضطراب کیا جانے
حجاب نام ہے کوتاہی نگاہ کا رزم
وہ حسن شوخ یہ قید حجاب کیا جانے

اور آخر کی غزلوں میں تو فن اور جذبے کا یہ امتزاج اپنے انتہائی نقطے پر نظر آتا ہے۔ ان کی غزل :-
”یہ دیر و حرم کہنے کو فقط کا شانے بدلتے جاتے ہیں“۔ اپنے اندر جذبات کی رعنائی کے ساتھ ایک ایسا نغمہ، لے اور موسیقیت رکھتی ہے کہ اس کے ہر مصرعے میں ساز بکتے ہوئے نظر آتے ہیں:-

اک گردش چشم ساقی سے ہے دور نیا نظم نئی
ہے مشرب زدی پھر بھی وہی پیانے بدلتے جاتے ہیں
کیا دور چیں، کیا عہد خزاں، کیا صبح ازل کیا شام ابد
میکش کی جو مستی بڑھتی ہے میخانے بدلتے جاتے ہیں

رزم کی غزل و صرف زندگی کو توانائی اور طاقت کا احساس دلاتی ہے بلکہ غزل کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ اگرچہ کلیم الدین احمد کے اس قول کا کہ ”غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے“ ایک زبردست رد عمل شروع ہو چکا ہے اور پنجاب کے وہ شعرا جو ترقی پسندی کی دھن میں آزاد نظم اور گیت وغیرہ ہی کو شاعری سمجھ بیٹھے تھے اس راہ میں اپنی ناکامی دیکھ کر پھر غزل کی طرف واپس چلے آئے ہیں اور ادھر ڈیڑھ دو سال سے رسالوں میں ان آزاد نظم کے شاعروں کی غزلیں پھر شاعری میں افراتفری کا نمونہ پیش کر رہی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب بھی غزل کہنا اور اس صنف میں کامیاب شاعری کرنا بہت مشکل ہے بقول مجنوں اس میں ایک طرح کے ضبط اور توازن کی ضرورت ہے اور جب تک جذبات و احساسات کو پوری طرح مفہم و کلیل نہ کیا جائے غزل میں رعنائی اور شعریت نہیں آسکتی۔ زمانہ تیزی کے ساتھ انقلاب کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اردو غزل میں ابھی بہت کچھ لگانا کی آمیزش ہوگی لیکن آنے والی تاریخ یگانہ اور فراق کے ساتھ شاید ایک گنام شاعر کو بھی یاد کرے گی جو آج ایک مخصوص حلقے میں رہتا ہے اور قصیدہ گو کی حیثیت سے مشہور ہے اور ”ثواب“ کی خاطر اپنے اہل کار نامہ کی خاطر لاپرواہی برت رہا ہو۔ فہیل الرحمن عظیمی

۱- ان کے رائے کی مشہور کتاب

”چین کا انقلاب جواب انقلاب“ کا ایک باب

بدیسی حملہ

(یہ سلسلہ ماضی)

جاگیردار حکمران طبقہ کی گھٹی میں یہ بات پڑی تھی کہ وہ تجارتی حرکت و عمل کی ترقی کے مخالف تھے جو صرف چین کے لئے مخصوص نہ تھی بلکہ یورپ میں بھی صنعتی و تجارتی ادارے جاگیردارانہ وسائل دولت کی حد بندیوں کو سیکڑوں برس کی سخت نزاع کے بعد توڑ سکے، چین میں یہ لڑائی اور بھی سنگین اور طویل ہونا تھی، اس وجہ سے کہ وہاں پیداوار کے طبعی حالات نے معاشیات کو بہت تنگ اور چھپلا بنا دیا تھا، سو لھویں سترھویں صدی میں جبکہ قدیم یورپنی تاجروں نے ساحل چین پر قدم رکھا تو ملک کے قومی وسائل دولت کا مسئلہ ایسا نازک ہو چکا تھا کہ محض ہلکی سی خارجی مداخلت اس کو درہم برہم کر دے سکتی تھی، اس وقت یورپ والوں کے پاس چینیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے لئے کچھ نہ تھا، وہ صرف چینی صنعتوں کو خریدنے کے لئے آتے تھے، کیونکہ ان کی شہرت قدیم زمانہ سے چلی آرہی تھی، اگر تجارتی برآمد پر پابندیاں نہ ہوتیں تو صنعتی پیداواروں کی رفتار میں زور پیدا ہو جاتا، اور مزدوری میں ابتری پیدا ہو جاتی، اس خرابی کو دور کرنے کے لئے غذا پیدا کرنے والے مزدوروں سے کام لیا جاتا، اناج کی قلت ہوتی، قحط پڑتا، اور انقلاب کے ساتھ، حکمران خاندان کی برطرفی اور خانہ جنگی ملک پر چھا جاتی جب قومی وسائل دولت کے نازک توازن میں خفیف ترین بھی برہمی ہوتی، سو لھویں اور سترھویں صدی حتیٰ کہ اس کے بعد بھی چین کے حکمران طبقہ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ جتنا کو ”ارضیات“ سے بھٹک کر ”صنعی“ شاخ پر پہنچنے سے روکیں بدیسی تاجروں کے داخلہ پر جو چین کی دستکاری کی پیداواروں کی تلاش میں آتے، پابندیاں عاید نہ کرنے سے دیسی دستکاریوں میں پھیلاؤ ہو جاتا یہ اراضیات کی گنی اور بیحد بھری ہوئی آبادی سے زیادہ مزدوروں کو کھینچتا، ان اراضیات کی پیداوار میں بھی جن حالات کے تحت یہ صورت حال واقع ہوئی، پیدا کرنے والے کے لئے حکمران طبقہ کا حصہ دینے کے بعد کچھ بچت نہ ہوتی چین میں تاریخ کے بہت ہی قدیم ترین زمانہ سے دستکاری کی صنعتوں کو فروغ تھا، اس نے جاگیردارانہ سرکاری، عمرانی، ہنر کی ترکیبی کے لئے ایک اضافی بنیاد کا کام کیا، جب تک وہ زراعت سے وابستہ و متحد رہے، جب تک دستکار و صنایع ادلا اور

خصوصاً ایک کسان ہوتا جس پر جاگیر دارانہ تعلقات کی دھونس ہوتی لیکن دستکاری کا بحیثیت ایک آزاد جدید طریق پیداوار کے زراعت سے جدا ہونا جاگیر دانہ سر قبیلی عمرانی تنظیم کی بنیاد کھوکھلی کر دے گا، جیسا کہ اس نے یورپ کے مالکیوں کیا ایسی علیحدگی کے لئے تجارتی مال کا آزادانہ تبادلہ ایک ذریعہ ہے، یورپی تاجروں کی آمد نے ایسے تبادلہ کے لئے بڑے امکانات پیدا کر دیئے، اس لئے چین کی جاگیر دارانہ ریاست اور اس کے معاونوں نے ملک میں داخل ہونے والے بریسی تاجروں کی راہ میں ہر قسم کے موانع پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔

اس حیثیت سے حکمران طبقہ کا رویہ بریسیوں کے باب میں عام طور پر مخالفانہ نہ تھا۔ یہ لڑکھڑاتے ہوئے نظام جاگیر دارانہ کاروبار تجارت کے پھیلاؤ کے خلاف تھا جو یقیناً اس کی (نظام جاگیر داری) کھوکھلی بنیاد کو جھنجھوڑ دیتا، سترھویں صدی میں برٹشالی اور ہسپانوی تاجر جانباڑوں کو مسلسل نکال باہر کیا گیا اس کے برعکس یسوعیوں کو داخلہ کی آزادی تھی اور ۱۵۸۳ء تک ان کو اپنا تعلیمی مشغلہ جاری رکھنے کی اجازت دی گئی، یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ چین کا حکمران اس حیثیت سے بریسیوں کا مخالف نہ تھا اس کے علاوہ یسوعیوں کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا گیا ان کی سرپرستی کی گئی، اس کے برخلاف ڈومینگی رامیوں کو نکال دیا گیا چین کے مذہبی اور عمرانی اداروں کے ساتھ سابق الزکر کے روادارانہ رویہ کے معنی تھے جاگیر دارانہ سر قبیلی حکمران طبقہ کی حمایت، اس کے برعکس ڈومینگی رامیوں کی کٹر مذہبیت میں اصلاح یورپ کی ایک ہلکی سی حدائے باز گشت تھی، اور اس لئے اس میں چین کے حکمران طبقہ کی حیثیت کے لئے ایک خطرہ تھا، اس طبقہ کا استقرار بیشتر متحد تھا ایسی معاشرانہ مذہبی رسوم جیسے پرستش آبا کی بقا پر دوسرے الفاظ میں عیسائی مذہب کے ہر دو فرقوں کے عمرانی پس منظر سے چین کے حکمران طبقہ کے ساتھ ان کے رشتہ تعلقات کی تعین ہوتی تھی، چین کے جاگیر دارانہ نظام میں یسوعیوں کا خیر مقدم کیا گیا، اس وجہ سے کہ وہ نظام ازمندہ وسطی کی نیابت کرتے اور "اصلاح" کے سخت دشمن تھے اس کے برعکس ڈومینگی رامیوں کو برداشت نہیں کیا گیا کیونکہ وہ شہری متوسط طبقہ سے قریب تر تھے اور اصلاح سے ہمدردی رکھتے تھے، دعا کے لحاظ سے جاگیر دارانہ سر قبیلی حکمران طبقہ کی پاداری کے لئے ایک ڈراوا تھے، ڈومینگی رامیوں کا عمرانی الحاق ان کے اعمال میں منعکس تھا، یسوعیوں کے برعکس انھوں نے بحیثیت عنفوان شہنشاہیت کے تصوراتی علمبرداروں کے چین کی داخلی سیاست سے دل بہلانا شروع کیا، اس شہنشاہیت کی فوجیں تاجر رہزنوں کے روپ میں چین کے دروازہ پر گولہ باریاں کر رہی تھیں۔

جدید صنعتوں کی ترقی میں ایک نیازور دینے سے دیسی متوسط شہری طبقہ کے اُبھار میں عجلت پیدا ہوتی یہ طبقہ موقع پا کر سیاسی اقتدار کے لئے آخر کار نزاع شروع کرتا، اس لئے بندوق کے دہانہ پر آخر مجبور ہو کر چینی حکمران طبقہ نے یورپی آنے والوں کو تجارتی حق دیا لیکن انھوں نے چینیوں کے باب میں ہر قسم کی پابندیاں رکھیں، جاگیر دارانہ سر قبیلی ریاست نے بریسی تجارت کو بلا شرکت غیر اپنے قبضہ میں رکھا، جیسا کہ روایاتی طور پر داخلی تجارت کی حالت یہ صرف ایک

بندرگاہ میں محصور تھی، ۱۸۵۷ء کے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ بدلیسیوں کو صرف کینٹن کے بندرگاہ سے چین کے ساتھ تجارت کرنے کی اجازت تھی، اور وہ ایک سرکاری بورڈ سے بلا شرکت غیرے کاروبار کرنے پر مجبور تھے، بورڈ کا دفتر شہنشاہ کا ذاتی نائب ہوتا جس کی طرف سے وہ امور انجام دیتا۔

اس طور سے مشہور ”ہانگ تاجروں“ کا وجود ہوا، جنہوں نے جدید دنیا سے چین کے ابتدائی روابط میں اتنا اہم فرض انجام دیا، ہمارے عہد میں یوروپین تاجر کا دیسی چینی منظم ہانگ تاجروں کی ذریات میں سے ہے، یوروپین تاجروں کے یہ دیسی چینی منتظمین آج چین کے قومی وسائل دولت پر چھائے ہوئے ہیں، یہ شہنشاہیت پرستانہ مانتا اور بیشتر سرمایہ دارانہ دیسی پیداوار کے درمیان ربط و اتصال پیدا کرتے ہیں۔

پیدا کرنے والے تاجروں کی رہنمائی میں چین سرمایہ دارانہ معاشیات کے بلند تر اسٹیج پر آیا، یہ سرمایہ دارانہ سرکاری ریاست کے جزو سالم تھے، اور اپنے لئے درجہ کے لحاظ سے دیسی شہنشاہیت کی نفع خوری کے آلہ کار بھی ان حالات کے تحت سرمایہ دارانہ دنیا سے رابطہ نے پتھر میں مدفون چینی عمرانیات پر طبع چڑھا دیا، جہاں تک تقسیم کا تعلق ہے صرف ایک صورت میں اس نے چین کی قومی دولت پر اثر ڈالا، قومی معاشیات کی بنیادی صورت، یعنی پیداوار قدیم نیم جاگیر دارانہ نیم سرمایہ دارانہ حالت میں رہی ایک مندا اور جامد طریق پیداوار پر ایک انقلاب انگیز نظام تقسیم کے معنی تھے پیدا کرنے والی جتنا زیادہ نفع اٹھاتا، داخلی تجارت ایک بڑے سابقہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی بنیاد پر ترقی کر چکی تھی جس نے پیدا کرنے والے کو اس کی پیداوار کی بچت ہی سے نہیں بلکہ اس کی پیداوار کے ضروری جزو سے بھی اس کو محروم کر دیا تھا، دوسرے الفاظ میں رجعت پسندانہ تجارتی نظام سرمایہ داری جاگیر دارانہ نفع کے منصوبے کے تحت ترقی کر گیا تھا، اس موقع پر دیسی تاجروں نے مداخلت کی اس مداخلت میں چین کی قومی معاشیات کے خلاف تعصب کام کر رہا تھا شاید وہ (قومی معاشیات) جاگیر دارانہ نیم سرمایہ دارانہ پیداوار کی حد بندیوں کو توڑ کر صنعتی سرمایہ داری کی بلند سطح پر پہنچ جائے، چین کے قومی وسائل دولت پر دیسی مداخلت کا یہ رجعت پسندانہ اثر پڑتا تھا، اس نے ان طبقات کی حیثیت مضبوط کر دی جو پیداوار کے اندر انقلاب انگیزی میں رکاوٹ ڈالتے تھے، یہ طبقات جاگیر دار امیروں اور تاجروں پر مشتمل تھے۔

پیداوار کی قابل لحاظ ترقی کی غیر موجودگی میں تجارت کے پھیلاؤ (جس کا سبب بازار عالم سے رابطہ ہے) کے لئے تھے ملک کی ضروری پیداوار پر مزید ناجائز قبضہ!۔ پیدا کرنے والا اس حیثیت میں گر چکا تھا جہاں اس کو اپنے وسائل اور طریق پیداوار کو ترقی دینے کا امکان کم تر تھا، دوسری طرف دیسی میکا کی ذریعہ سے بنی ہوئی دستکاری کو تباہ کرنے کے لئے غیر الکی اشیاء کی درآمد چینی بازار میں ہونے لگی، کسان کو اصول ارتقاء کے تحت معاشیات کی پس ماندگی سے ارفع سطح پر جانے کی بجائے پیچھے کی طرف ڈھکیں دیا گیا، چین کی قومی معاشیات کی انقلاب انگیز سرمایہ دارانہ ترقی کے لئے حالات بہت آہستہ آہستہ اور محنت کے ساتھ بچتے ہوئے تھے اس کا سبب پیداوار کے غیر مفید طبعی حالات تھے، چینی قومی معاشیات کا سرمایہ دارانہ عالمی بازار سے

زبردستی رابطہ پیدا کر کے اس طریق عمل پر مزید قابو حاصل کیا گیا، چینی تجارت میں بدلیوں کو کوئی نفع نہیں ہو سکتا تھا بجز اسکے کہ وہ اس ملک کی قومی معاشیات کی آزادانہ ترقی کو روک دیں، ایسا ہی تھا اور اب بھی زیادہ تر ایسا ہی ہے، چین کی داخلی اور خارجی دونوں تجارت زیادہ تر سابقہ سرمایہ دارانہ حالات کے تحت پیدا شدہ اشیاء کی تقسیم ہے۔

تقریباً ایک صدی تک چین کی بدیسی تجارت دونوں طرف سے بلا شرکت غیرے حالات کے تحت چل رہی تھی، اس وقت یورپین قومیں اپنے سمندر پار کی تجارت معاہدہ کے تحت بڑی بڑی کمپنیوں کے واسطے سے چلا رہی تھیں جو انجام کار بڑی بڑی سلطنتوں کی بانی ہوئیں، انیسویں سلطنتوں کے ابتدائی عشروں میں عالمی بازار کے ساتھ چین کے رابطہ پر عملی سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی بلا شرکت غیرے چھائی ہوئی تھی، شکریہ کہ برطانیہ کو ہندوستان میں فتح ہوئی اور اس نے ڈچ کو مبدان سے بھگا دیا، ۱۸۳۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے مشرقی تجارت میں سارے اجارہ دارانہ حقوق کا خاتمہ کر دیا، سرمایہ دارانہ پیداوار کی ترقی نے یورپ کی اجارہ دار کمپنیوں کو غائب کر دیا، چینی پہلو کی اجارہ داری کی بارگاہ کو بھی توڑ ڈالنے کے لئے کوشش شروع ہوئی، مشرقی تجارت کی ترکیب میں انقلاب نے ان کوششوں کو ضروری بنا دیا پہلے یورپی تاجر مشرقی ممالک میں ان کی دستکاری کی پیداوار لانے کے لئے جاتے تھے، جن کی یورپ میں بڑی مانگ تھی، قیمتی دھاتوں اور سامان تعیش کے ذریعہ ان کا زرخشن ادا کیا جاتا، انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ سے صورت حال میں جزوی طور پر تغیر ہونے لگا، اس وقت خاص اشیاء جو چین سے لائی جاتی تھیں، چائے اور ریشم کے کپڑے تھے، اور ان کا زرخشن بیشتر افیون کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا جو ہندوستان میں پیدا ہوتی تھی اور جس پر برطانوی حکومت کا بلا شرکت غیرے قبضہ تھا، لیکن تجارت میں انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا، انگلستان اپنے طیارے ہوئے سامان بالخصوص سوئی کپڑوں کی برآمد کے لئے طیارہ تھا، جن کی مشرق میں خاص ضرورت ہے، اس نے اپنی سوئی صنعتوں کو زبردستی ہندوستان میں داخل کر دیا تھا اور تجارت کی لازمی آزادی حاصل کرنے کے طریق عمل میں ایک حکومت قائم کر چکا تھا، اب اس نے اپنی نظر چین کی بڑی جنتا پر ڈالی، جاگیر دارانہ حکمران طبقہ کے ساتھ تاجروں کا رشتہ اتحاد ہو گیا اور وہ قومی معاشیات کے ایک نظام کے تحت بننے لگے، یہ معاشی نظام نہ راحت اور دستکاری کی، ایک ناقابل تقسیم مجموعہ میں شیرازہ بندی کرتا تھا، قدرتی طور پر وہ ملک میں ایسے سامان کے آزادانہ داخلہ کے مخالف تھے، جس کے متعلق یقین تھا کہ دیسی پیداوار کے مندا طریق کو متسر کر دے گا، اس مخالفت کا اظہار شہنشاہ چی۔ بن۔ کنگ کے خطاب نام شاہ جارج سوم میں کیا گیا ہے۔ ۱۸۴۰ء میں پہلا انگریزی وفد لارڈ میکالہ کی سرکردگی میں دونوں ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات کو ترقی دینے کے لئے پہنچا، شہنشاہ چین نے مجمع عام میں انگریزی وفد کی پذیرائی کی، اور ممتاز دیسی سے کہا کہ چین کو دیسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے چیز جس کی اس کو ضرورت ہے وہ پیدا کرتا ہے لیکن چونکہ دوسرے ممالک کو چینی پیداواروں، چائے، ریشم کپڑے، چینی کے غلوں وغیرہ کی اس قدر ضرورت ہے کہ میں دیسی تاجروں کو ان چیزوں کی خریداری کے لئے چین میں آنے کی اجازت دوں گا۔

۱۸۱۳ء میں ایک دوسرا برطانوی وفد چین میں آیا، نتیجہ کچھ زیادہ بہتر نہ نکلا، ایسٹ انڈیا کمپنی کو ختم کر دینے کے بعد انگلستان نے چین میں تجارت کی آزادی کو محفوظ کرنے کے لئے زیادہ زور آور طریقے استعمال کئے، لارڈ ڈیئر کو آزادانہ تجارت کی نگرانی، چین کو واکرنے، اور قومی مساوات کا دعویٰ کرنے کے لئے کنینٹن میں بھیجا، اس کو کنینٹن سے نکال باہر کیا گیا۔ نیپئر کے مقصد کی ناکامی کا نتیجہ ”جنگ افیون“ ہوا جو کہ چین میں طے شدہ فوجی حملہ کی ابتداء تھا، جنگ کی وجہ افیون کے بیوپار پر جثت تھی، لیکن حقیقی وجہ شکل تجارت کی قلب ماہیت تھی، جب سے یورپی تاجروں نے چین میں اس کی دستکاری کی مصنوعات کے لئے آنا شروع کیا وہ خاص خاص مقامات میں ایک خاص جماعت سے معاملہ کرتے تھے، لیکن جب انھوں نے فروخت کے لئے اپنے طیار کردہ سامان کے ساتھ آنا شروع کیا اور سامان کی نوعیت ایسی تھی جس نے چینی ارباب اختیار کو ملک میں ان کے آزادانہ داخلہ کا مخالف بنادیا، تو یورپی تاجر اپنی پہلی حیثیت سے مطمئن نہ ہو سکے۔ وہ اپنا طیار کردہ سامان چین سے ایک سخت دستکاری کی مصنوعات لینا نہیں چاہتے تھے، بلکہ خام پیداواریں چاہتے تھے، جن کو اپنے وطنی ممالک میں وہ چیزیں طیار کرنے میں منتقل کرتے، چین اور یورپ کے صنعتی ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات پر مستبدانہ ضوابط کی پابندیاں نہیں رہ سکتی تھیں، جن کو شہنشاہ جی۔ یں کنگ نے واضح کیا تھا، چونکہ حکمران طبقہ راضی نہ ہوا، اس لئے پیرامن تجارت کی آزادی تشدد آمیز ذرائع سے حاصل ہونی چاہئے۔

(باقی)

عبدالمالک اردوی

طوفانِ محبت

حضرت ہوشنگ بگرامی المناط بہ نواب ہوش یار جنگ کی معیاری ثمنوی۔ جس میں حسن و عشق کی دلورزد استان اس زبان اور لب و لہجہ میں بیان کی گئی ہے جس کو اب دنیا ترس رہی ہے اور کہیں نہیں پاتی۔

اس ثمنوی کو وہ خصوصیت جو کسی اور ثمنوی میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ اس میں مذہب و اخلاق کے نکات بھی انتہائی دلاویز رنگ میں بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں فاضل مصنف نے ثمنوی نگاری پر تاریخی و تنقیدی روشنی بھی ڈالی ہے اور حضرت نیاز فتحپوری کا ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:- ”فنی محاسن اس ثمنوی میں جا بجا اتنے بھرے ہوئے ہیں کہ نہ ان کو میں سمیٹ سکتا ہوں اور نہ وہ ان کی وضاحت سے مطمئن ہو سکتا ہے۔“ ظاہری حسن کے متعلق غالباً اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ وہ بہترین بیرونی ٹائپ میں چھپی ہے اور نہایت دبیز ولایتی کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

صفحات ۲۹۸ قیمت مجلد سات روپیہ۔ غیر مجلد پانچ روپیہ

لے کا پتہ:- سکریٹری نواب ہوش یار جنگ۔ سرفراز منزل۔ برکت پورہ۔ حیدرآباد۔ دکن

بانی تحریک کی روح و رواں

زریں تاج - قرۃ العین

ایران کی بانی تحریک بڑی مشہور چیز ہے اور اب بھی ہندوستان، یورپ و امریکہ میں کہیں کہیں اس کے آثار ملتے ہیں۔ اس تحریک کی تاریخ ایشیا و قربانی اور عزم و استقلال کی عجیب و غریب داستان ہے۔ جس کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس تحریک کی تاریخ کا زریں حصہ وہ ہے جو ”قرۃ العین“ سے تعلق رکھتا ہے، جو اپنے والدانہ جوش اور غیر معمولی عزم و ثبات کے لحاظ سے میرا بانی اور جون آف آرک کی صف میں آتی ہے۔

قرۃ العین کی تاریخ ولادت صحیح طور پر نہیں معلوم اور نہ اس کی زندگی کے مسلسل واقعات کہیں ملتے ہیں، لیکن دو باتیں بالکل یقینی طور پر معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بڑی جمیل عورت تھی دوسرے یہ کہ بانی تحریک کی وہ اس قدر شیدائی تھی کہ اسی کی بدولت اس کی جان گئی۔

قرۃ العین کے والد حاجی ملا محمد صالح، قزوین کے بڑے ذمی اثر مجتہد تھے۔ ایک زمانہ میں رشت کے حاجی سید قاسم سے ان کے خاص تعلقات رہ چکے تھے جو شیخ احمد احصائی (شیخی تحریک کے بانی) کے خاص شاگرد و جانشین تھے۔

حاجی سید قاسم کی چونکہ اس کے گھر زیادہ آمد و رفت تھی اس لئے قرۃ العین نے سب سے پہلے انھیں کی زبان اس نئی تحریک کا ذکر سنا اور اس پر غور کرنے لگی۔ اس کا اصلی نام زریں تاج تھا لیکن حاجی سید قاسم اس کو قرۃ العین ہی کہہ کر پکارا کرتے اور بعد کو وہ اسی نام سے مشہور ہو گئی۔

اس کی ابتدائی تعلیم ایسے ماحول میں ہوئی جو فضل و کمال کے لحاظ سے خصوصیت فاصتہ رکھتا تھا۔ اور اس لئے اس نے وہ سب کچھ حاصل کیا جو اس وقت عام طور پر مردوں کی فضیلت کے لئے ضروری تھا۔ فقہ، حدیث اور قرآن پر اس کو اتنا عبور حاصل تھا کہ جس وقت اس کا باپ اپنے بھائی اور بھتیجے سے علمی مباحثہ کرتا تھا تو یہ بھی باپ کی طرف سے اس میں شریک ہوتی تھی۔ یہ ابھی کم سن ہی تھی کہ برگن کے مجتہد اخوند محمد تقی سے اس کی نسبت ہو گئی، لیکن شادی چچا زاد بھائی حاجی ملا محمد تقی سے ہوئی جو خود بھی قزوین کا بہت بڑا زبردست عالم تھا۔

قرۃ العین نے حسن و جمال اور فضل و کمال کے علاوہ، ذہن بھی بلا کا پایا تھا اور طبیعت میں غیر معمولی عزم و ثبات تھا۔

عربی ادب کے علاوہ علم حدیث کی بھی بڑی محقق تھی، قرآن کی تمام متداول تفسیروں کا ناقدانہ مطالعہ بھی اس نے کیا تھا اور قزوین بھر میں اس کے فضل و کمال کا بڑا شہرہ تھا۔

جب سید قاسم کا انتقال ہو گیا تو قرۃ العین نے اس کے شاگرد خاص ملاحسین کو لکھا کہ ”میں شیخی اصول کی متبع ہوں اور اس بات کی قایل ہوں کہ انسان پر ملہمات غیبی نازل ہو سکتے ہیں اور وہ مظہر خداوندی ہو سکتا ہے۔“ ملاحسین اپنے شیخ کے اس اصول کی تحقیق و جستجو میں باہر نکل پڑے اور گھومتے پھرتے شیراز پہنچے۔ یہاں مرزا علی محمد باب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ خود بھی بابی عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس تحریک کا پیغمبر کہتے ہیں۔ ملاحسین نے ان کی قیادت کو تسلیم کیا اور قرۃ العین کا بھی خط دکھایا۔ باب پر اس کا بہت اثر ہوا اور قرۃ العین کو اس نے اپنے مخصوص انیس متبعین میں شامل کر لیا جنہیں وہ ”حروف الحی“ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

یہ واقعہ ۱۲۶۲ھ کا ہے۔ لیکن خود قرۃ العین کو باب سے ملنے کا موقعہ کبھی نہیں ملا۔

قرۃ العین نے بابی مذہب اختیار کرتے ہی پردہ کو خیر باد کہہ دیا اور بابی تحریک کی تبلیغ میں مصروف ہو گئی۔ اس کی بے پردگی کو اس کے تمام خاندان والوں نے بہت برا سمجھا اور سوسائٹی میں اس پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ لوگوں نے اسے بہت سمجھایا، لیکن اس نے کسی کی نہیں سنی اور رفتہ رفتہ اس کے مقلدین کی جماعت بڑھنے لگی، یہاں تک کہ قزوین و جماعتوں میں تقسیم ہو گیا، ایک اس کی طرف تھی اور دوسری تمام دوسرے علماء کی طرف۔

کچھ دن بعد وہ کربلا کی زیارت کے لئے گئی اور وہاں اس نے لکچروں کا سلسلہ شروع کیا جن کو عورتیں بھی پردہ کے پیچھے بیٹھ کر سنتی تھیں۔ یہاں کے علماء کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور انہوں نے قرۃ العین کو برا بھلا کہنا شروع کیا، لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور اس کے متبعین کی تعداد بڑھتی گئی جو نہایت سختی سے بابی اصول کی پابندی کرتے تھے۔ ان میں ایک پابندی یہ بھی تھی کہ بازار کی گلی گلی، دینی چیز وہ قطعاً نہ کھاتے تھے۔ قرۃ العین نے اب اپنے آپ کو جناب فاطمہ کا مظہر کہنا شروع کیا اور اس کی خیر بترکی حکومت کو ملی تو کربلا کے گورنر نے اسے گرفتار کرنے کا ارادہ کیا۔ قرۃ العین کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ میں تمام سنی و شیعہ عالموں کو حیناج ریتی ہوں، مجھ سے بحث کر لیں اور اگر میں ہار جاؤں تو بیشک مجھے گرفتار کر لیں۔ کربلا کے گورنر کو اس کا علم ہوا تو اس نے کہا کہ میں اس باب میں بغداد کے حاکم اعلیٰ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، لیکن جب تک وہاں سے جواب نہ آئے قرۃ العین، کربلا چھوڑ کر باہر نہ جائے۔ لیکن قرۃ العین نے اس حکم کی پروا نہ کی اور وہ سپاہیوں سے نظر بچا کر مع اپنے چند رفیقوں کے کربلا سے روانہ ہو کر بغداد کی طرف چل دی۔

یہاں وہ مفتی اعظم سے ملی اور اپنی گفتگو سے اس کو اس قدر برہم کر دیا کہ اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی۔ بغداد کے حاکم اعلیٰ نے باب عالی سے استعراج کیا تو وہاں سے ہدایت ہوئی کہ قرۃ العین کو کسی نہ کسی طرح بغداد سے ایران پہنچا دیا جائے۔

راستہ میں خود اس کے رفیقوں سے بعض مسائل میں بحث آپڑی اور انھوں نے باب سے شکایت کی کہ کیا ایک عورت کیلئے مناسب ہے کہ وہ کھلم کھلا بے پردہ ہو کر وعظ کہتی پھرے۔

باب نے قرۃ العین کی موافقت میں جواب دیا اور اسی کے ساتھ جناب طاہرہ کے لقب سے بھی اسے سرفراز کیا۔

کرنا شاہ اور مہدآن میں پہونچکر اس نے پھر تبلیغی لکچر شروع کئے اور بہت سے متبعین پیدا کر لئے۔ مہدآن سے اس نے ہایتخت جانے کا ارادہ کیا تاکہ خود شاہ ایران محمد شاہ کو بابی مذہب کی طرف متوجہ کرے۔

قرۃ العین کے والد نے اس کی مخالفت کی اور کچھ آدمی روانہ کئے کہ وہ اسے قزوین واپس لے آئیں۔ جب وہ قزوین آئی تو اس کے والد نے اس کو مجبور کیا کہ وہ بابی مذہب کو ترک کر دے اور اپنے شوہر کے پاس واپس آئے، لیکن وہ باز نہیں آئی اور برابر بابی مذہب کی تبلیغ کرتی رہی۔

۱۲۶۴ھ میں حاجی محمد تقی نے (جو اس کا چچا بھی تھا اور خسر بھی) علانیہ باب اور اس کی تعلیمات کی مخالفت شروع کی اور ایک دن جبکہ وہ عام جلسہ میں باب کو بڑا کہہ رہا تھا، تین بابیوں نے اسے قتل کر دیا۔

اس واقعہ سے بڑا ہیجان پیدا ہو گیا اور اس قتل کا اصل مجرم قرۃ العین کو قرار دیکر متبعین کے ساتھ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن چونکہ واقعی یہ مجرم نہ تھی اس لئے بعد کو رہا کر دی گئی، اور اس کو صرف شہر چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔

یہاں سے وہ خراسان جانے کے ارادہ سے پہلے طہران پہونچی لیکن یہاں سے اسے مازندران کی طرف روانہ کیا گیا اور جب وہ بدشت پہونچی تو یہاں بابی مذہب کے بعض سربراہ اور وہ علماء، اس کی ملاقات ہوئی۔ ان میں مرزا یحییٰ (صبح ازل) ملا حسین اور حاجی ملا محمد علی بھی تھے۔

باب کی تاریخ میں یہ اجتماع خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی صحبت میں قرۃ العین اور حاجی ملا محمد علی کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور اس نے ایک طویل مثنوی لکھ کر ملا محمد علی کے دلائل کی تردید کی۔

بدشت سے وہ صبح ازل کو ساتھ لیکر جو ابھی بہت کمسن تھا، نور گئی اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے شیخ طبرسی کے مقبرہ میں پناہ لی جو بغاوت مازندران کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ جب تک بغاوت فرو نہیں ہو گئی، قرۃ العین کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی اور وہ نور میں اطمینان سے بیٹھی رہی، لیکن اس کے بعد نور والوں نے اسے بھی مرکزی حکومت کے حوالہ کر دیا۔ جب یہ طہران پہونچی تو ناصر الدین شاہ کے حضور میں لائی گئی۔ بادشاہ اس کے حسن و جمال اور قابلیت سے بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ اسے پریشان نہ کیا جائے اور پولیس کے حاکم اعلیٰ کی نگرانی میں دیدی گئی۔ اسکے بعد جب شاعر میں بابیوں نے بادشاہ کو قتل کرنا چاہا اور حکومت کی طرف ہنگامہ دار و گیر شروع ہوا تو قرۃ العین پر بھی مصیبت آئی اور اسکی نجات کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی، وہ یہ کہ اپنے عقاید سے باز آئے، لیکن اسے منظور نہ کیا اور نہایت جبراً کے ساتھ ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ تیشہ جلا دے سامنے اپنی گردن جھکا دی۔ قرۃ العین میں شاعرانہ اہلیت بھی بہت زبرد پائی جاتی تھی لیکن اس کا پورا کلام دستیاب نہ ہو سکا اور پروفیسر براؤن اسکی صرف دو غزلیں اور ایک مثنوی پاسکے۔

ماحول و وراثت کا اثر انسانی زندگی پر

جب سے انسان زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کی نظر ڈالنے لگا ہے اسی وقت سے اس نے اس مسئلہ پر بھی بحث شروع کی کہ آیا انسانی ترقی کا مدار ماحول پر ہے یا وراثت (Heredity) پر۔ بعض حکماء نے ماحول کو زیادہ اہمیت دی اور بعض نے وراثت کو گروہ نے۔

غرض کہ یہ بحث اسی طرح جاری رہی حتیٰ کہ لاک (Locke) نے انسانی دماغ کو (Tabula Rasa) موم کی ٹکیہ کہہ کر مختلف طریقوں سے یہ ثابت کیا کہ انسان فطرت کی طرف سے کوئی خصوصیت (خواہ وہ اچھی ہو یا بُری) لیکر پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کا ماحول اس کو سب کچھ سکھاتا ہے اس نظریہ نے عرصہ تک انسانی ذہن کو اپنے الجھاؤ میں مبتلا رکھا اور مختلف فلاسفہ جن میں مارکس بھی شامل ہے اسی نظریہ کی روشنی میں اپنی اپنی خیالی دنیا بناتے رہے۔ بر خلاف اس کے ماہرین علم الحیوانات یہ کہتے رہے کہ انسان اپنے والدین اور آباؤ اجداد کی خصوصیات سے بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے چنانچہ انھوں نے مختلف لوگوں کے خون کا معائنہ کر کے اس میں مختلف جانوروں کے خون کے اجزاء کی موجودگی ثابت کی اور اس طرح ڈارون (Darwin) کے نظریہ کو حرف بہ حرف صحیح ثابت کرنے کی ہر امکانی کوشش کر ڈالی۔ اس بحث نے نفسیات کی دنیا میں آکر کیا صورت اختیار کی اور اب موجودہ ماہرین کا اس سلسلہ میں کیا نظریہ ہے آئیے اس پر غور کریں۔

ماہرین نفسیات کے لئے یہ مسئلہ ابھی کافی پیچیدہ ہے، چنانچہ فلسفیوں کے اس گروہ میں بھی انتہا پسندوں کی کمی نہیں اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے اس سلسلہ میں ہم ”نظریہ کردار“ (Behaviourism) کے علمبرداروں کو پیش کر سکتے ہیں اس ”مکتب“ (School) کا ایک مشہور مفکر واٹسن نے انسان کو صرف ماحول کا نتیجہ قرار دیا ہے چنانچہ اس کا قول ہے کہ ہر بچے کے لئے خاص ماحول ہیا کر کے ہم اسے خاص قسم کا انسان بنا سکتے ہیں۔ یعنی ہم ہر بچہ کو علیحدہ علیحدہ ماحول ہیا کر کے ہٹلر، مسولینی، اسٹالین اور ابراہیم لنکن بنا سکتے ہیں۔ ابتدا میں جب یہ نظریہ امریکن عوام کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے، سارے اخبارات اور رسائل نے بیک وقت اس پر تبصرے لکھے۔ لیکن اس نشہ کا خمار جلد اُتر گیا اور اس کے خلاف ردِ عمل شروع ہو گیا کیونکہ نظریاتی حیثیت سے یہ دعویٰ کتنا ہی بلند ہو لیکن عملاً سخت بایوس کن ہے، کیونکہ اس میں انفرادی کمزوریوں اور انسانی حد بندیوں کا قطعی خیال نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ تیس چالیس کے اندر ہی اندر سواروس کے اور کوئی ملک اس انتہا پسند نظریے کا قائل نہیں جہاں کے سرکاری

تجربہ گاہوں میں اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر تجربات کئے جا رہے ہیں۔

ایک دوسرا اسکول ہے جو اس کے برخلاف "مقصدیت" (Purposivism) کا قائل ہے اس کے موجد میکڈوگل کا خیال ہے کہ انسان کی تمام حرکات و سکنات بنیادی طور پر جبلت کے تحت ہوتی ہیں جو انسان کو کوئی خاص حرکت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ انسانی زندگی پر ماحول کے اثرات کا بھی معتقد ہے لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بہر صورت بنیادی طور پر ہر انسانی یا حیوانی حرکت اپنی شکل نہیں بدلتی خواہ وہ ارتقاء کے کتنے ہی منازل کیوں نہ طے کرے۔ مثلاً غصہ ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک انسانوں اور حیوانوں کا ایک مخصوص جذبہ رہا ہے جو اب بھی باقی ہے گو اس کے اظہار کے طریقوں میں تبدیلی آگئی ہے، مثلاً غصہ کی صورت میں حیوانی رد عمل یہ ہوتا ہے کہ غصہ دلانے والے سے دست و گریباں ہو جائے، اور بہر صورت اس کو زک پہنچا کر تسکین حاصل کیجئے یہ غصہ کا جسمانی اظہار ہوا، آج ہذب لوگوں میں یہی جذبہ دوسری صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ سلجھے ہوئے لوگ خفا ہونے کی صورت میں سراور کندھوں کو زور سے جھٹکا دیکر غصہ کا اظہار کرتے ہیں، یا ہاتھ پاؤں سے کام لیکر قلم کے ذریعہ سے اس جذبہ کی تسکین حاصل کرتے ہیں، بعض لوگ ایک شخص کے خلاف غصہ کا مظاہرہ اس کی پوری قوم سے نفرت کی صورت میں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان مثالوں سے یہ تجربی واضح ہو چاہے کہ اظہار خواہ کتنا ہی مسخ شدہ کیوں نہ ہو مگر انسان کے سارے جذبات ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک اسی صورت میں قائم ہیں اور انھیں قوانین قدرت کی طرح ثبات اور باثباتی حاصل ہے۔ یہاں تک نوعیت نظریاتی حیثیت سے بحث کی گئی، اب آئیے اس پر تجرباتی حیثیت سے غور کریں۔ یہ معلوم کرنا کہ عموماً ماحول کا اثر کتنا فیصدی ہوتا ہے اور وراثت کا کتنا، اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ البتہ ایک عام اصول یہ بتایا جاسکتا ہے کہ جس شخص کو جتنی زیادہ تربیت ملنے کا امکان ہوگا اسی قدر وہ اپنی ابتدا کی جلی سرحدوں سے علیحدہ ہوتا چلا جائے گا اور یہی وہ مقصد ہے جس کے حصول کی کوشش ہماری ساری سوسائٹی اور تعلیمی درسگاہیں شعوری اور غیر شعوری طور پر کرتی ہیں۔ انفرادی حیثیت کے علاوہ اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انسانوں کی مزاجی اور ذہنی کیفیات میں تسلی و قومی معایب و محاسن بھی شامل ہوتے ہیں چنانچہ گوروں اور جلیشیوں کی ذہانت میں خاصہ فرق ہوتا ہے۔ یہی حال خود گوری نسل والے مختلف ممالک کے باشندوں کا ہے، چنانچہ ایک تجربہ کی رو سے یورپین اقوام میں پولینڈ والے ذہنی حیثیت سے سب سے کمزور پائے گئے۔ غرض کہ تسلی تفریق کی مثالیں اتنی واضح ہیں کہ ان کو تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی لہذا اس بحث سے گریز کر کے ہم علم الحیوانات کے ماہرین کی چند رایوں کا ذکر کریں گے۔ تھارن ڈائیک جو ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ علم الحیوانات کا بھی ماہر تھا وراثت کے بارے میں کہتا ہے:-

"دماغی اور جسمانی وراثت کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں اس خبر کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ بچے اپنے والدین کے جسم اور دماغ کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ مادہ منویہ کے کیڑوں کی مدد سے ان کا نقطہ قرار پاتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم گو والدین کے جراثیم کی

خصوصیات معلوم ہیں تو ہم یقیناً جنین کے متعلق پیشین گوئی کر سکتے۔ مثال کے طور پر ایک چھ فٹ کے آدمی کے مادہ منویہ کے کچھ کپڑے چھ فٹ والے ہو سکتے ہیں اور کچھ چھ فٹ دو انچ والے۔ اسی طرح انکی لمبائی پانچ فٹ گیارہ انچ یا پانچ فٹ دس انچ بھی ہو سکتی ہے۔ جراثیم کی لمبائی کا یہی تفاوت اولاد کے قدر کی چھوٹائی، بڑائی کا باعث ہوتا ہے اور اسی سبب سے بعض چھوٹے قدر والوں کے بڑے قدر کے ہوتے ہیں اور بعض انتہائی ذہین آدمیوں کے لڑکے انتہائی احمق۔

جراثیم کی خصوصیات میں تفریق کے باوجود عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان براہ راست اپنے والدین کی جسمانی اور ذہنی خوبیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً بہرے پن کو لیجئے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر چار آدمیوں میں سے جن کے کوئی بھائی یا بہن بہرے ہیں ایک ضرور بہرا ہوگا اور اسی طرح اُن لوگوں میں سے جن کے بھائیوں اور بہنوں کو یہ عارضہ لاحق نہیں ہے ہزار میں ایک بہرا ہوگا۔

وراثت میں ذہانت کا مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے چنانچہ گالٹن کی تحقیقات نے وراثت کا درجہ بہت بلند کر دیا ہے، اس ماسٹر کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۷ مشہور اشخاص کے اعزہ واقربا تین سو گنا زیادہ مشہور ہوئے۔ اسی طرح پروفیسر اوڈن (Oodan) نے سات سو شاہی خاندان کے افراد کی ترقی کا باعث ان کی خاندانی وسیع الدماغی کو قرار دیا۔ پروفیسر برن ہال (Bern Hall) کی تحقیقات بھی کچھ انسی قسم کے نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے انھوں نے مشہور و معروف ہستیوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تمام لوگ اُن لوگوں کے اعزہ تھے جو بذات خود بے انتہا شہرت کے مالک رہ چکے تھے۔

مندرجہ بالا مشہور ماسٹرین نے زیادہ تر وراثت کی ہمہ گیری پر زور دیا ہے لیکن کیٹل (Cattell) وراثت کا ماحول دونوں کو انسانی ترقی کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا خیال ہے کہ ”ہمارے سائنسدانوں کی نصف تعداد ہماری آبادی کے اس ایک فیصد ہی متحمل افراد کی پیداوار ہے جو ذہنی اور دنیاوی دولت کے باعث ایسے با علم افراد کی پیدائش کے باعث ہو سکتے تھے، چنانچہ کسی مشہور کاروباری آدمی کے لڑکے کی کامیابی کا ایک عام انسان کی کامیابی کے مقابلہ میں، گنا زیادہ امکان ہے۔“

افراد کے مابین یہ تفریق کچھ تو خاندانی خصوصیات کے سبب ہے لیکن کافی حصہ اس میں اُن حالات یا اس ماحول کا بھی ہے جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن اگر اس سوال کا جواب طلب کیا جائے کہ وراثت یا ماحول میں کس کی قوت زیادہ ہے تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ تو بالکل اسی قسم کا سوال ہے کہ کسی اسپرنگ کا پھیلاؤ آدمی کی طاقت کے باعث ہوتا ہے یا اسپرنگ کی خاص بناوٹ کے سبب سے؟۔ اور اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ”کچھ اسپرنگیں (Springs) باوجود ساری طاقت کے استعمال کے ایک فٹ بھی نہیں پھیلائی جاسکتیں اور کوئی بھی اسپرنگ بلا طاقت کے استعمال کے پھیل نہیں سکتی۔“

فرائیڈ کے ”نفسی تجزیہ“ کی رو سے بیشتر کمزور دماغ اور ذہنی مرض والے عموماً ایسے لوگوں کی اولاد ہوتے ہیں جو خود

دماغی امراض کا شکار تھے، پچھلی جنگ سے قبل کے جرمنی میں حکومت کی طرف سے دماغی اور دوسرے جسمانی مریضوں کو شادی کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی یہ امتناعی احکام اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مریض والدین اپنے بچوں میں اپنے مرض کی پیدائش کے شدید امکانات پیدا کر دیتے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تندرستی یا بیماری کے اثرات اولاد کو وراثت کی صورت میں ملتے ہیں، چنانچہ آج بھی بہت سے مہذب ممالک میں مریضوں کو شادی کی قانوناً اجازت نہیں ہے۔ پروفیسر گوڈارد (Godard) نے اپنی کتاب کالیک فمیلی (Kallik Family) میں ایک ایسے خاندان کا واقعہ درج کیا ہے جس کے مورث اعلیٰ نے دو شادیاں کیں ان میں سے پہلی بیوی نے جو دماغی حیثیت سے کمزور تھی اور جس سے اس کے ناجائز تعلقات بھی رہ چکے تھے ایسی اولاد کو جنم دیا جو بعد میں شرابی، چوری آورہ گرد اور طوائف بنی لیکن دوسری شادی سے نہایت ہی تندرست اور صحیح الدماغ افراد پیدا ہوئے۔ حالانکہ دونوں خاندانوں کا ماحول شروع سے آخر تک یکساں رہا کیونکہ دونوں خاندان دولت اور جائداد کے یکساں مالک تھے اور ایک ہی جگہ برابر برابر مکانوں میں رہتے تھے۔ لیکن اس کے برخلاف ہمیں "خود ساختہ" (Self-made) لوگوں کی بیشتر مثالیں ایسی ملتی ہیں جنہوں نے مناسب ماحول پیدا کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی جگہیں اور عہد حاصل کئے حالانکہ قدرت نے ان کے ساتھ ظلم کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ امریکہ کے سابق صدر روزولٹ کو کون نہیں جانتا ان کی فالج زدہ ٹانگوں کو دیکھ کر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک دن یہ صدر جمہوریہ امریکہ بنے گا۔ اسی طرح ہندوستان کی تاریخ میں حیدر علی خاں جو ایک معمولی سپاہی تھا، فرماؤں ہو گیا۔ خود انگریزی قوم کے اکثر ہندوستانی دانشور اور گورنر جنرل کیا تھے، کلائیو ایک کلرک کی حیثیت سے ابتداء ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم ہوا، ہٹلر، موسولینی، مصطفیٰ کمال پاشا اور دوسری تاریخی عظیم الشان شخصیتیں ایسی گزری ہیں، جنہوں نے وراثت کے قانون کے خلاف ماحول کو سازگار بنایا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ماحول کے اثرات بلاشبہ عالمگیر ہیں اور مناسب ماحول پیدا کر کے ایک خاص حد تک ہر انسان کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر فرانسس گالٹن (Francis Galton) کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص دماغی قابلیتیں مثلاً سیاسی سوچ، بوجہ، منصف مزاجی، ادب و شعر سے دلچسپی، عملی ذوق اور اسی قسم کی دوسری چیزیں اولاد کو والدین سے ورثے میں ملتی ہیں۔ میں خود علم الحیوانات کا طالب علم نہیں لیکن میرے ایک ماہر علم الحیوانات دوست نے مجھ سے ذکر کیا جو اس سلسلہ میں مفید ثابت ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اولاد اپنے ماں باپ سے اپنی پیدائشی شخصیت کا نصف حصہ وراثت میں پاتی ہے بقیہ چوتھائی حصہ اپنے دادا اور دادی سے اور اسی طرح ہڈی کے اوتار کی پشتوں سے استفادہ کرتی ہے۔ لیکن یہ قانون میرے خیال میں قطعی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ اولاد کو عام ذہانت کی ایک خاص مقدار ورثے میں ملتی ہے اور پھر یہ ماحول کا کام ہے کہ وہ انسان کو اس ذہانت سے کام لینے پر مجبور کرتا ہے یا خود انسان اس ذہانت سے ماحول کو اپنے موافق بناتا یا بگاڑتا ہے۔

مندرجہ بالا دلیلوں سے یقیناً یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ وراثت اور بالخصوص خاندانی خصوصیات سے انسان بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے اور ان خصوصیات کے مناسب اظہار کو ماحول یا سوسائٹی کی مختلف طاقتیں علیحدہ علیحدہ رنگ دیتی ہیں۔ لہذا حکومت کا فرض یہ ہونا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی کی جائے کہ بچے تندرست و توانا پیدا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ انمل اور بے جوڑ شادیوں کو ممنوع قرار دیا جائے اور قانون کی رو سے دماغی مریض اور جسمانی حیثیت سے کمزور اصحاب کو شادی کی اجازت نہ دی جائے کیونکہ بہر حال صرف آبادی کی زیادتی ہمارا مقصد نہ ہونا چاہئے بلکہ اچھے اور تندرست شہری پیدا کرنے کی کوشش ہمارا مقصد اولیٰ ہونا چاہئے یہ نظریہ صرف طبی حیثیت ہی سے مفید نہیں ہے بلکہ ذہنی بھی درست ہے کیونکہ ایسی اولاد پیدا کرنا جو بڑی ہو کر قوم و ملت اور انسانیت کے کسی کام نہ آ سکے محض بیکار ہے اور افزائش نسل کا مسئلہ جو یقیناً ایک شرعی مسئلہ ہے اس قسم کی پیدا نشوں سے حل نہیں ہوتا۔ وراثت کے اثرات سے قطع نظر حکومت کو ماحول کی درستگی کی بھی کوشش کرنی چاہئے تاکہ موجودہ آبادی کو انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں پر ترقی کرنے کے یکساں مواقع مل سکیں اگر حکومت نے اس بات کی طرف توجہ کی تو یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جب ہمارے ملک سے جبرائیم پیشہ اور مریض ذہنیت کے افراد کا نام و نشان مٹ جائے گا اور دنیا میں جنت کا قیام، جو ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک ہماری تہذیب و تمدن کی محبوب ترین خواہش رہی ہے، ممکن ہو سکے گا۔

خواجہ حبیب احمدا۔ اے

ماہنامہ "شاعر" اگر

مقاط ترقی یافتہ ادب کا تنہا علمبردار ہے۔۔۔ بیس سال سے زبان و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے۔
 دوامی اور عوامی قدروں کی نیابت کرتا ہے۔۔۔ ادبی شکر کا وہ صحیفہ ہے جس کے ہر صفحہ پر زندگی کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔
 جو رحمت پرستی کا دشمن، انتہا پسندوں کا مخالف اور درمیانی راہوں کا موید ہے۔۔۔ اپنے علمی و ادبی مسلک کا خود خالق ہے، کسی کا مقلد نہیں۔۔۔ ہر سال اپنے خریداروں کو ایک ضخیم اور مفید المثال "خاص اشاعت" پیش کرتا ہے۔
 حسن کتابت و طباعت، ترتیب اور معیار کے اعتبار سے بھی ناقابلِ مقابلہ ہے۔
 اپنے شہر کے ایجنٹوں یا ریلوے اسٹالوں سے خریدئے

چند سالانہ پانچ روپیہ۔۔۔ ششماہی تین روپیہ۔۔۔ فی پرچہ آٹھ آنے

(نمونہ کے لئے آٹھ آنے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں)

منیجر ماہنامہ "شاعر" قصر الادب اگر

ذوق کا تغزل

ہر شخص کی طبیعت کا مذاق حالات کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، کبھی ہم کو ایک چیز اچھی معلوم ہوتی ہے، کبھی دوسری۔ شعرا کا بھی یہی حال ہے وہ یکے بعد دیگرے بہت سے شاعروں سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور آخر میں کسی ایک کا انداز بیان اختیار کر لیتے ہیں یا اپنا نیا رنگ تیار کرتے ہیں۔ ذوق بھی وقتاً فوقتاً مختلف شعرا سے اثر پذیر ہوتے رہے اور اسی لئے ان کے کلام کا انداز بھی بدلتا رہا ہے۔

ذوق کے ابتدائی کلام سے صاف ظاہر ہے کہ ان کو سودا کا کلام بہت پسند تھا اور انھیں کے انداز کی تقلید کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ان کی پہلی غزل سودا کی ”نقش پا“ والی زمین کی ہے۔

ذوق شاہ نصیر کی شاگردی سے منہ موڑ کر روز افزوں شہرت حاصل کرتے کرتے ولی عہد کی استاد کی مرتبہ حاصل کر رہے تھے۔ ادھر شاہ نصیر بھی دکن چلے گئے تھے۔ عرصہ دراز کے بعد جب وہ واپس آئے اور استاد شاگرد میں معرکہ شروع ہوا تو ذوق کو بھی اپنا کمال ثابت کرنے کے لئے یہی انداز سخن اختیار کرنا پڑا جس میں شاہ نصیر شاعری کر رہے تھے اس لئے شاہ نصیر کی ”نقش کی تیلیاں“ اور ”مگس کی تیلیاں“ کی طرح مشکل قوافی و ردیف اختیار کئے۔ ذوق نے مشکل سے مشکل مضامین کو آسان الفاظ میں ادا کیا اور کہیں کہیں نامانوس قوافی کو بھی اس طرح برتا ہے کہ اشعار کی سلاست و روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نصیر کا شعر ہے:-

سرِ معرکہ عشق میں آساں نہیں دینا گاڑے ہے جہاں شمع قدم اٹھ نہیں سکتا
اس کے مقابلہ میں ذوق کا شعر ملاحظہ ہو:-

حسرت پہ اُس مسافر بکیں کی روئے جو تھک رہا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
کتنا صاف و موثر ہے۔

ذوق اور شاہ نصیر کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں تھی، مگر ایک کے مقابلہ میں دوسرا غزلیں کہا کرتا تھا۔ ذوق نے مشکل ردیف و قافیہ کے استعمال سے زیادہ محاورہ بندی کے نمونے پیش کئے ہیں، اس کے متعلق وحید الدین سلیم کی رائے بڑی مددگار درست معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:- ”دہلی کے شعرا میں نصیر حد سے زیادہ سنگلاخ زمینوں پر چلنے کے عادی ہیں اور ان کا اثر ذوق پر بھی پڑا مگر ذوق اور ظفر نے محاورہ بندی کا خاص شیوہ اختیار کیا ہے ان کی شاعری کا مقصد مجیز اس کے اور کچھ

نہیں کہ عام بول چال اور محاورات کو روشناس کریں اس بنا پر ان کے کلام میں جس قدر محاورہ اور ضرب المثلیں پائی جاتی ہیں اتنی کسی شاعر کے کلام میں نہیں۔ لغت نویس انھیں کے کلام سے ان چیزوں کی سند پیش کرتے ہیں مگر ذوق کے شاگرد داغ نے آخر زمانہ میں محاورہ بندی کو اپنی شاعری کا مقصد نہیں رکھا تھا۔

یوں تو ذوق کے زیادہ تر اشعار میں کوئی نہ کوئی محاورہ نظر آتا ہے مگر مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

گل اُس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا	یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا
مرے نالوں سے چپ ہیں مرغ خوشاں لجاں زمانہ میں	صد اطلو طلی کی سنتا کون ہے نقار خانہ میں
پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کہیں مردوں کا منہ	شیر سیدھا تیرا ہے وقت رفتن آب میں
کیا دشمنی ہے اہل کرم سے کہے ہے چرخ	یاں تک جھکاؤں شاخِ ثمرور کو توڑ دوں
ہے جی میں اپنے غرہ جوہر کو توڑ دوں	آئینہ خیال مگر کو توڑ دوں

ذوق کا یہ رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ غالب بھی بقول سرور اسی رنگ میں اشعار کہنے لگے تھے مصنف آثار غالب بھی بڑی حد تک اس خیال سے متفق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ”بادشاہ اور شہزادے شاہ نصیر کی طرز کے مداح تھے جسے ذوق نے برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا بھی مشاعروں میں دیکھتے تھے کہ وہی غزلیں مقبول ہوتی ہیں جن کی زبان سادہ اور آسان ہو، تشبیہیں اور فارسی ترکیبیں اس قدر ہوں جس قدر آٹے میں نمک روزمرہ اور محاورہ کی افراط ہو مرزا پر بھی یہی رنگ چڑھنے لگا اور اس دور کی بعض غزلوں پر ذوق کا رنگ غالب ہے۔ مثلاً غالب کی وہ مشہور غزل جس کے مقطع میں بہادر شاہ ظفر کے ارادہ حج کی طرف اشارہ ہے جس غزل کا شاید کوئی شعر ایسا نہیں جسے ذوق دیکھ سکتا ہو۔ مضامین سادہ اور عامیانه ہیں اور روزمرہ کی افراط ہے۔“

ذوق کے کلام کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لفظی حیثیت صنائع و بدائع اور فقرات و ترکیب کے استعمال میں ناسخ سے بڑی حد تک متاثر تھے اور اس رنگ کو یہاں تک نبھا ہا کہ لوگ ان کو دہلی کا ناسخ کہنے لگے، چونکہ ذوق پہلے ہی نصیر سے متاثر تھے اس لئے یہ آسانی ناسخ کے بھی رنگ نے اپنا اثر جالیا بعض اشعار پر تو ناسخ ہی کے کلام کا شبہ ہونے لگتا ہے مثلاً:-

شوق ہے اس کو بھی طرزِ نازِ عشاق سے	دمہ دم چھوڑے ہے منہ سے دورِ قلبیاں چھوڑ کر
زلفِ افعی دش کو دھو دے گروہ پر فنِ آب میں	ہو بجائے موج پیدا مار رہزون آب میں
چنی تو نے افشاں جو اے مجھ میں ہے	ستاروں میں کیا کیا چناں اوجھ میں ہے
کئے ضبطِ اشک آہ پہونچی فلک پر	مرا عشق کم خرچ بالانشیں ہے

لیکن چونکہ ذوق آخر کار دہلی کے رہنے والے تھے اس لئے ان کے کلام میں جا بجا جذبات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے اور ان کا کلام صرف نقطوں کا گورکھ دھندا ہی نہیں ہے بلکہ اعلیٰ مضامین کا بھی حامل ہے کاشف الحقائق، اور شعر الہند، کے مصنفین سے متفق الرائے ہو کر فراتق کہتے ہیں۔ ”ذوق کی غزلیں کیسی ہیں۔ ان میں جا بجا جذباتی اور داخلی پہلو کی جھلک بھی دکھائی

دیتی ہے اور ان کا کلام صحرائے بے آب و گیاہ کی طرح بالکل خشک اور بیخیر نہیں ہے (بلکہ خس و خاشاک کے ڈھیر میں دو چار بھول بھی ہیں) اس میں شک نہیں کہ کلام کا زیادہ حصہ خارجی اور مصنوعی قسم کی شاعری کا نمونہ ہے لیکن اس رنگ کو بھی ذوق نے اپنی مثالی، تھوڑا کلامی اور استادانہ انداز سے سجا دیا ہے۔ بیان میں پختگی، شستگی اور استادانہ شان ملتی ہے، غالب و مومن کے کلام کی سی معنویت و داخلیت نہ سہی لیکن ناسخ کے کلام کی طرح ذوق کے اشعار رنگ و رواں بھی نہیں ہیں، وہ ناسخ سے متاثر ضرور تھے لیکن وہ دلی کے شاعر تھے اس لئے غالب، مومن اور اپنے شاگرد ظفر کے یہاں پر خلوص رنگ کی شاعری دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے اس قسم کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

معلوم جو ہوتا ہمیں انتخابِ محبت لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ جس طرح آشنا سے کہ کوئی آشنا صلاح

لے گیا دل کون کس کا نام لوں، سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

کیوں جی کے پھر میں ہوئے شرمندہ یار سے اب مر رہے ہیں اس کی پشیمانیوں میں ہم

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخی اضطراب میں واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

اس تپش کا ہے مزہ دل ہی کو حاصل ہوتا کاشش میں سرتا بہت دم دل ہوتا

اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانہ یاس بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوق کے کلام پر دہلی کے معاصرین شعر کا عموماً اور ظفر کا خصوصاً اثر پڑا۔ اس میں شک

نہیں کہ ذوق ظفر کے استاد تھے مگر نفسیاتی طور پر بہت سی خصوصیات شاگرد کی بھی استاد میں پیدا ہو جاتی ہیں، علاوہ ازیں

اصلاح کرنے کے سلسلہ میں ظفر کا کلام برابر ذوق کے پیش نظر رہتا تھا، پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ لگاتار سینتالیس سال ظفر کا

کلام پڑھنے اور دیکھنے کے باوجود ذوق پر اثر نہ پڑتا۔

بہادر شاہ کی اصلاح کے ابتدائی زمانہ میں چونکہ دلی عہد کو عشقیہ اور شوخ شاعری کا چسکا تھا لہذا ان کی طبیعت کو

خوش کرنے کے لئے اور اپنی بھی جوانی کی امنگوں میں کچھ اشعار جبرأت و مصحفی کے رنگ میں بھی کہے ہیں مثلاً :-

اب تورات آخر ہوئی میری طرف دیکھو ذرا مسجدوں میں لوگ اذان لے مہلقا دینے کو ہیں

غم کہتا ہوں دل میں رہوں میں جلوہ جاں کہتا ہوں کسکو نکالوں کسکو رکھوں یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

کیا جانتے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

نواب الہی بخش خاں معروف کے کلام کی اصلاح کے زمانہ میں ان کی طبیعت کے رنگ کا کچھ نہ کچھ پڑا تو ذوق کے کلام پر پڑا ہے

چونکہ معرفت سن رسیدہ تھے اور اکثر تصوف و معرفت کے اشعار کہا کرتے تھے لہذا ذوق کے بھی کلام میں کچھ اشعار اس رنگ کے جمع ہو گئے ہیں مثلاً:-

جیتے جی ہی کیا ملک فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے ادھر سے جبکہ چھٹے تو جا کے ادھر کے جھگڑے ہیں

ہستی سے بھی آرام زیادہ ہے عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

کچھ غزلیات میں تو ایک ایک دور و دور کے جرأت، انشاد و مصحفی، نصیر اور ناسخ وغیرہ بھی کارنگ یکجا ہو گیا ہے۔

الغرض ذوق کا پورا کلام کسی خاص رنگ میں نہیں ہے بلکہ جستہ جستہ ہر قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس بنا پر بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ انھوں نے نہ نظیر کی طرح خارجی شاعری کی، نہ درہ کی طرح صوفیانہ اشعار کہے، نہ غالب کی طرح حکیمانہ باتیں بیاں کیں اور نہ مہر کی طرح عاشقانہ اور سوز و گداز سے بھرے ہوئے آئینو بہائے۔

گو ذوق کے زمانہ میں علم النفس کا چرچا نہ ہونے کے برابر تھا پھر بھی انھوں نے بعض اشعار میں نفسیات محبت خوب بیان کی ہے۔ مثلاً:-

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے

ذوق کے کلام میں رفتہ رفتہ پختگی آگئی تھی اس کا اندازہ ان کے ابتدائی اور آخری کلام کے مقابلہ سے بخوبی ہو جاتا ہے

کیا مضمون اور کیا اسلوب بیان دونوں بہتر سے بہتر بن جاتے ہیں مثلاً ان کے ابتدائی زمانہ کی غزل ہے:-

کہتے ہیں لوگ موت کو سب جائے جائے ہے
پر میرے پاس اسے بھی کوئی کھائے جائے ہے

ٹوٹا ہے کس پتنگ کا بازو کہ شمع بزم
یوں روغن اشک گرم سے ٹپکائے جائے ہے

ابر مرزہ برس کے اگر کھل گیا تو کھپا
نالہ تو وہ ہی آگ سی برسائے جائے ہے

جب تک کہ جان تن سے نکل جائے گی نہ ذوق
دل میں جو درد ہے سو کوئی ہائے دائے ہے

اس میں شک نہیں کہ بعض اشعار اس غزل میں اچھے نکل گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں ابتداء ہی سے شعر کہنے کی

صلاحیت موجود تھی لیکن بعد کو یہی صلاحیت قدرت میں تبدیل ہو گئی۔ آخری زمانہ کی ایک غزل ملاحظہ ہو:-

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے د اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط پر ہم جیسے بدتمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوئے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے
 ذوق نے بعض اشعار میں صفائی۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ جذباتِ محبت کا بھی اظہار کیا ہے۔ مثلاً:-
 کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت ایک دن آدھی کبھی سنائی آدھی کبھی سنائی
 پڑے تفرقے یہ جسدانی میں تیری کہ میں ہوں کہیں دل کہیں جاں کہیں ہے
 ذوق غالب کی طرح رشک و حسد کے پتلے نہیں تھے مگر پھر بھی بحیثیت انسان اس جذبہ سے معرا نہیں تھے، کہیں کہیں
 اشعار میں بھی اس کی جھلک بھی آگئی ہے اور بعض اشعار تو بہترین انداز میں لائے ہیں۔ مثلاً:-
 وہ جب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہونے تھے صبا کے جھونکے یاں وقت سحر ایسے نہ ہوتے تھے
 صفائی و سلاست اور روانی بیان تو ذوق کے کلام میں ڈھونڈنے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک نظر ڈالتے ہی اس کی بہت سی
 مثالیں نظر آنے لگتی ہیں درحقیقت ذوق زبان اور اسلوب بیان کے ماہر ہیں۔ جہاں کہیں جذبات نے صفائی و سلاست کے تھما
 شعر کا جام پہنا ہے وہاں ذوق کی مہارت سخن اور استادی بہت لگ جاتی ہے۔

بیقراری کا سبب ہر کام کی امید ہے ناامیدی سے مگر آرام کی امید ہے
 ذوق کے کلام کی روانی، جستی بندش اور اس کی ہلکی و نرم آہنگ پو پ اور ایڈرین کے انداز کی معلوم ہوتی ہے۔
 ذوق کی زبان نظیر اکبر آبادی کی طرح بالکل عوام اور دیہاتیوں کی زبان نہیں ہے بلکہ ان کی زبان میں نظیر کی سی سادگی
 کے باوجود تمام فن کارانہ صفات بھی موجود ہیں۔ ذوق کے اشعار کی عمومیت میں ادبی رنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام
 فصاحت کے خلاف نہیں ہونے پایا ہے اور خواص کے حلقہ کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔
 بدری پر شاو۔ ایم۔ اے

جیسا کہ شہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس
 کوئی ثبوتِ صداقت نہیں ہے، انا نہ انا آپ کا نسل ہے۔
 یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی
 ہے ولایت تک اس کے علاج موجود ہیں۔
 داعی کو زوری کے لئے اس کی صفت ہے، چنانچہ، بوٹھے سب کھانڈ
 ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور شہ جات
 بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ روئیں یہ دوا
 اور باغیچہ میں کھڑے کر دیتے ہیں اس قدر مقوی دماغ ہے کہ کھین کی باتیں
 بھی غور بخور دماغ لگتی ہیں اس کو مثل آبِ حیات کے تصور فرمائیے
 اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی
 چھ سات ستر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی اس کے استعمال
 سے مانتے کام کرنے سے مطلقاً تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا سادوں
 کو مثل گلارہ کے بھول کے شرخ اور مثل کنڈن کے درختاں بنا دیا
 یہ دوا ان ہی نہیں ہے بلکہ ہزاروں بالورس اصطلاح ان کے استعمال سے
 امر دین کو مثل شیرازہ سولہ سال کے جوان کے بن گئے ہیں۔ یہ نہایت
 قیمتی دوا ہے کہ آپ کو یہ دیکھائیے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر
 میں نہیں ہے۔ قیمت فی شیشی ۴۰ روپے چار روپیہ (لکھنؤ)
 (نوٹ) قادیانہ ہر وقت و ایما۔ قیمت دو روپے نصف شیشی
 میں افندو کو حاضر و انور جان کر لکھتا ہوں کہ دوا اس کے کام لگتی ہے۔
 نقاروں سے ہو شاد رہتے۔ میری ۲۰ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔
 پیٹ۔ جلیقم شہادت علی بیچ زبان جویش کلام
 (حاکم شہنوی مولانا نے روم صاحب)
 محمود لکھنؤ - بو۔ پی

چاند تک تین دن میں

سلسلہ میں امریکہ کا ایک ہوائی جہاز ۱۰۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گیا۔ اس کے ۳۵ سال بعد ۱۹۶۴ء میں کیپن چارلس نے ۸۳۶ میل فی گھنٹہ کی رفتار کا ریکارڈ قائم کیا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ رفتار ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ تک پہنچ جائے جو چاند یا دوسرے سیاروں تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔

امریکہ کے نیویارک ٹائمز کا خیال ہے کہ بہت سے لوگ اس رفتار کو دیکھنے کے لئے زندہ رہیں گے، کیونکہ اس وقت تک ۱۰ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار تو راکٹ قسم کے جہازوں سے ممکن ہو گئی ہے، اور آئندہ جو کوشش ہو رہی ہے اس سے اس رفتار کا ۲۰ ہزار میل ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار اس مقصد کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ کشش زمین کا مقابلہ ہم اس سے کم رفتار میں نہیں کر سکتے۔ اگر اس سے کم رفتار کا جہاز اوپر جائے گا اور اس کا مسالہ کشش زمین کے حدود کے اندر ہی ختم ہو جائیگا تو وہ پھر زمین پر آ رہے گا، اس لئے ضرورت ہے کہ وہ ایک ہی جہت میں ۲۵ ہزار میل طے کرے اور کشش زمین کے دائرہ سے باہر ہو جائے۔

اس سلسلہ میں کئی مشکلات حایل ہیں، ایک یہ کہ اس رفتار کے حاصل کرنے کے لئے جہاز کو کس قوت سے چلایا جائے، نیز یہ کہ چاند تک پہنچنے کے لئے جو ۲ لاکھ ۳۸ ہزار میل کا سفر ۲ گھنٹے میں طے کرنا پڑے گا، اس کے لئے کتنا مسالہ درکار ہو گا اور وہ کہاں رکھا جائیگا۔ اس مشکل کا حل تو یہ سوچا گیا ہے کہ جہاز کو جوہری قوت سے چلایا جائے گا، یعنی وہی قوت جس سے آٹم بم سر کیا جاتا ہے اور اس کے لئے زیادہ مسالہ کی ضرورت نہیں۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ فضا میں جو گیسیں پائی جاتی ہیں وہ اس قدر گرم ہیں کہ دنیا کی کوئی دھات یہاں تک کہ پتھر کی چٹان بھی ان کے اثر سے پگھلے بغیر نہیں رہ سکتی، لیکن ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ وہ اس کا تدارک کر لیں گے۔

تیسری دقت یہ ہے کہ فضا میں بہ کثرت شہابی ٹکڑے پائے جاتے ہیں، اور اگر جہاز ان سے ٹکرا گیا تو از خود دھوٹ جائے گا۔ الغرض یہ اور اس کے علاوہ فین انجینری کے لحاظ سے بھی اور بہت سی مشکلات ہیں، جن کے دور کرنے کی تدبیر پر غور کیا جا رہا ہے۔ رفتار کو زیادہ تیز کرنے میں جو چیز حایل ہے وہ ہوا ہے، کیونکہ وہ آگے بڑھنے سے روکتی ہے، لیکن چونکہ ۴۵۰ میل کی بلندی پر نہ صرف یہ کہ ہوا ختم ہو جاتی ہے بلکہ روشنی اور آواز کا وجود بھی نہیں ہے، اس لئے بعض کا خیال ہے کہ زیادہ بلندی پر پہنچ کر

رقار کا مسئلہ اتنا زیادہ سمجھدہ نہیں رہ جاتا اور کشش زمین کے حدود سے ہم جلد ہی گزر سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مصارف کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔ کناڈا کی راکٹ سوسائٹی نے حال ہی میں اندازہ کیا ہے کہ ۲۰۰ فٹ لمبے راکٹ پر جو چھ ہری قوت سے پرواز کریگا، کم از کم ۵۱ لاکھ ڈالر صرف ہوں گے اور اس کا خیال ہے ۱۹۶۰ء تک ایسا راکٹ طیارہ ہو سکے گا جو چاند تک پہنچ سکے۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ کشش زمین سے علیحدہ ہونے کے بعد جہاز اپنا سفر کس طرح طے کرے گا۔ اگر ۳ میل کی بلندی پر کشش زمین ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے تو جہاز اتنی بلندی پر زمین کے متوازی چلے گا اور چاند کے دائرہ کشش میں آکر جہاز کا موٹر چلانے کی ضرورت نہ ہوگی البتہ جب چاند کی کشش اسکو آہستہ آہستہ اپنے سے قریب تر لے آئے گی تو چاند کی سطح پر اترنے سے دو منٹ قبل موٹر پھر چلا دئے جائیں گے تاکہ جہاز آہستہ آہستہ چاند کی زمین پر اتر سکے۔

جہاز میں میز، کرسی وغیرہ کسی فرنیچر کا وجود بیکار ہوگا، کیونکہ یہ اشیاء تو اس لئے درکار ہوتی ہیں کہ ان پر کچھ چیزیں رکھی جائیں، لیکن کشش زمین سے علیحدہ ہونے کے بعد وزن کسی چیز میں باقی نہ رہے گا اور اس کے گرنے کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ اگر آپ کسی چیز کو اٹھا کر پھینکا جائے گا تو وہ نیچے نہ کرے گی۔ یہاں تک کہ اگر آپ گلاس سے پانی پینا چاہیں گے تو وہ بھی حلق میں نہ جائے گا بلکہ پھیل جائے گا اور بڑی بوتل سے اسے بچوں کی طرح پینا پڑے گا۔ کرسیوں اور میزوں کو جہاز کے فرش یا پہلو سے جڑ دینا پڑیگا اور کرسیوں میں بلٹ یا پٹیاں لگانی پڑیں گی تاکہ بیٹھنے والے ان سے بندھے رہیں، کھانے کی پلیٹوں کو میز سے ملائے رکھنے کے لئے مقناطیس کا استعمال ضروری ہوگا، چھریاں بھی بیکار ہوں گی اور گوشت کاٹنے کے لئے قینچی کی ضرورت ہوگی، حج، بط کی چونچ کی طرح ہوں گے تاکہ کھاتے وقت دودھ یا پانی فضا میں پھیل نہ جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں تو کشش زمین کی وجہ سے ہر چیز نیچے کی طرف گرتی ہے جس کا دوسرا نام وزن ہے اور اس کے روکنے کے لئے مختلف چیزیں درکار ہوتی ہیں، لیکن کشش زمین سے علیحدہ ہو کر جب وزن کا مفہوم کوئی نہ رہ جائے گا تو تمام چیزیں یہاں تک کہ آدمی بھی فضا میں معلق نظر آئیں گے، چنانچہ یہ مسئلہ بھی سامنے ہے کہ جہاز کی گندگی یا اس کا کوڑا کس طرح صاف کیا جائے گا اور کھانے کے رہزے یا دیگر ذرات کیونکر دور رکھے جائیں گے، ان کو جہاز کو کھینچ پھینک نہیں سکتے اس لئے وہ فضا میں تیرتے رہیں گے اور آملکھ کان میں گھسیں گے۔

بستر پر لیٹنے یا سونے کا بھی کوئی سوال پیدا نہ ہوگا، پیٹوں سے بندھے بندھے فضا میں معلق رہ کر آنکھیں جھپکالیں گے اسی طرح نہانے، کھانا کھانے، پانی پینے میں بڑی دشواری ہوگی اسکے لئے ایک مصنوعی کشش پیدا کرنے کے لئے جہاز کو فضا میں لٹو کی طرح گردش دی جائے گی۔ آکسیجن کی فراہمی کے لئے یہ تدبیر کی جائے گی کہ جہاز میں آکسیجن سے بھرے ہوئے ظروف رکھے جائیں گے اور سانس سے جو کاربن (زہریلا مادہ) پیدا ہوتا ہے، اس کے جذب کرنے کے لئے چند پودے گملوں کے رکھ دئے جائیں گے۔

چاند تک پہنچنے کے لئے تین دن درکار ہوں گے اور مریخ یا زہرہ تک پہنچنے کے لئے ایک مہینہ یا اس سے زیادہ وقت درکار ہوگا۔

مارشل پلان کا اثر روس پر

پچھلی لڑائی کے بعد ہی، روس اور امریکہ میں ایک ٹھنڈی لڑائی اور ٹھن گئی تھی۔ روس مشرقی یورپ پر اپنے اثرات بڑھاتا جا رہا تھا اور امریکہ مغربی یورپ کو ان اثرات سے بچانا چاہتا تھا۔ یہ گویا ایک غیر مسلح سیاسی جنگ تھی جس کی بنیاد صرف اقتصادی اصول پر قائم تھی۔ چونکہ لڑائی کے بعد سارا یورپ مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تھا، اس لئے اس کے دور کرنے کی تدبیر روس نے یہ بتائی کہ اشتراکیت اختیار کر لو اور امریکہ نے اس کا توڑ اس طرح کیا کہ مغربی یورپ کے تمام ممالک کو مالی امداد دینا شروع کی تاکہ وہ اقتصادی دشواریوں کا مقابلہ کر سکیں اور روس کے کہنے میں نہ آئیں۔ امریکہ کی اس تدبیر کو مارشل پلان کہتے ہیں۔

امریکی امداد کا مقصد یہ تھا کہ مغربی یورپ اپنی صنعت کو جو جنگ کی وجہ سے درہم برہم ہو گئی تھی، امریکہ سے مشینیں وغیرہ منگا کر پھر سدھارے، لیکن مغربی یورپ کے سامنے اس وقت سوال صرف پیٹ کا تھا اس لئے اس امداد کا بڑا حصہ صرف فراہمی غذا کی نذر ہو گیا اور مقصود پورا نہ ہوا۔ امریکہ کی جگہ اگر کوئی دوسرا ملک ہوتا تو شاید بہت بار جاتا، لیکن چونکہ اسکے پاس سونے کی کوئی انتہا نہیں ہے، اس لئے اس نے پھر دولت کا دھارا مغربی یورپ کی طرف بہا دیا اور اس مرتبہ امریکہ کو باؤس ہونا نہیں پڑا، کیونکہ اب صورت حال بہت بدل گئی ہے اور مغربی یورپ کی انڈسٹری پھر ابھرنے لگی ہے۔ چنانچہ مشرقی یورپ کے مقابلہ میں جو روس کے زیر اثر ہے، مغربی یورپ میں فولاد کی پیداوار اس وقت چھ گنا زائد ہے۔ اس طرح کوئلہ کی پیداوار گنتی، تیل کی ۱۳ گنا، تانبہ کی نو گنا اور بھاری انڈسٹری کی پانچ گنا زائد ہے۔

جنگ کے بعد مارشل پلان کے مطابق یا قرضوں کی صورت میں جو رقم مختلف ملکوں کو ملی ہے اسکی تعداد..... ۱۹۰۴۹ ڈالر ہے۔ اس رقم سے صرف..... ۱۵۶ ڈالر روس اور مشرقی یورپ کے ملکوں کو پہنچے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب لڑائی ختم ہوئی تھی، لیکن اب دو سال سے روس اور مشرقی یورپ کی امداد امریکہ نے بند کر دی ہے۔

مغربی جرمنی — مغربی جرمنی (جو امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے زیر اثر ہے) مارشل پلان کے مطابق..... ۲۵۳۴ ڈالر ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی انڈسٹری میں شکستہ کے اخیر تک ۶۴ فی صدی کا اضافہ ہوا، برآمد ڈھائی گنا بڑھ گئی، راشن میں اضافہ ہو گیا، کام کرنے والوں میں اشتراک کی اثرات رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔

فرانس — فرانس کو مارشل پلان کی رو سے..... ۳۳۴ ڈالر ملے اور اس سے فرانس کو یہ فائدہ ہوا کہ

یہاں کی انڈسٹری ۱۹۳۸ء کے سطح پر آگئی، غلہ کی پیداوار قبل از جنگ کی مقدار تک پہنچ گئی اور اشتراکی اثرات بہت ضعیف ہو گئے۔

برطانیہ — برطانیہ کو امریکہ نے ۹ ڈالر دئے اور اس سے برطانیہ کی فوجی طاقت پھر اتنی ہی ہو گئی جتنی قبل از جنگ پائی جاتی تھی۔

دیگر ممالک — اٹلی کو ۱۹ ڈالر ملے جس سے ہر چند انڈسٹری کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، لیکن افراط زر ضرور کم ہو گیا ہے۔

سوویت یونین کو ۱۲۵۳ ڈالر ملے جس سے وہاں کی انڈسٹری پر بہت اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ اسی طرح ناروے، بلجیم، ڈنمارک، یونان اور ترکی کو جو رقمیں ملی ہیں، ان سے وہاں کی اقتصادی حالات پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں مشرقی یورپ کی حالت دیکھئے جو روس کے زیر اثر ہے۔ چونکہ امریکہ نے روس اور اس کے زیر اثر تمام مشرقی یورپ کی حکومتوں میں اپنے یہاں کی تمام چیزیں بھیجنا بند کر دی ہیں اس لئے وہاں کی انڈسٹری ترقی کر رہی ہے اور نہ فوجی قوت بڑھ رہی ہے۔ روس چاہتا ہے کہ دس کروڑ ڈالر کی مشینری امریکہ سے حاصل کریں، لیکن اول تو اس کے پاس ڈالر نہیں اور اگر ہو بھی تو امریکہ اپنا کوئی مال وہاں بھیجنا نہیں چاہتا، اس لئے وہاں کی انڈسٹری کوئی ترقی نہیں کر سکی۔ اسی دوران میں جب روس نے مشرقی جرمنی کا راستہ بند کر دیا تھا اور مغربی جرمنی کی طرف سے آمد و رفت ختم ہو گئی تھی، تو چند دن میں وہاں کا یہ حال ہو گیا کہ تمام کارخانوں میں خاک اڑنے لگی، کیونکہ کوئلہ، فولاد وغیرہ سب اسی طرف سے جاتا تھا آخر کار روس کو پھر راستہ کھول دینا پڑا۔

زیکو سلاویکیا کو بھی ڈالر کی کمی اور امریکہ کی طرف سے درآمد کی ناکہ بندی نے مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہاں کے کارخانوں کی مشینریاں بیکار ہو گئی ہیں لیکن انھیں وہ بدل نہیں سکتا کیونکہ امریکہ بھیجتا نہیں اور روس فراہم نہیں کر سکتا۔ اس نے چاہا کہ ورلڈ بینک سے قرض حاصل کرے لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ یہی حال مشرقی یورپ کے دوسرے ممالک کا ہے جو روس کے زیر اثر ہیں۔

لڑائی کے بعد امریکہ کے اکسپورٹ بینک نے روس کو ایک ارب ڈالر کا قرض دینا تجویز کیا تھا اور ممکن ہے اسکی مقدار چھ ارب ڈالر تک پہنچ جاتی، لیکن اسٹالین نے اس پر زیادہ زور نہیں دیا اس لئے روس یہ قرض حاصل نہ کر سکا، اور اسکے بعد جب مارشل پلان شروع ہوا تو روس کی پالیسی ایسی نہ رہی کہ وہ امریکہ سے فائدہ اٹھا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ ان حالات کے زیر اثر اب اسٹالین کی پالیسی بدل رہی ہے اور وہ اپنی اس ٹھنڈی لڑائی کو واقعتی پوری طرح سرد کر دینا چاہتا ہے۔

باب الاستفسار

بوہرا جماعت

(جناب رشید صدیقی - اندور)

”ہندوستان میں بوہرہ فرقہ“ جو اپنے آپ کو ”داؤدی بوہرہ“ کہتی ہے اور اپنا سلسلہ نصب فاطمی خاندان (حکمران مصر) سے بتلاتی ہے۔ ان کے عقاید کیا ہیں اور ان کے پیشواؤں اعظم (ابو محمد طاہر سیف الدین) کی کیا حقیقت ہے۔ میں آپ کا بہت بہت ممنون ہوں گا اگر آپ تکلیف کو افرام کو مندرجہ بالا استفسار کا جواب تحریر فرمائیں گے۔

(نگا) المستنصر فاطمی خلیفہ مصر کے دو بیٹے تھے۔ ایک المستعلی دوسرے نزار۔ ایک جماعت المستعلی کی جانشینی کو صحیح سمجھتی ہے اور دوسری نزار کی جانشینی کو۔ پہلی جماعت بوہروں کی ہے، دوسری خوبہ قوم کی۔

بوہرا، گجراتی لفظ ہو رو سے نکلا ہے جس کے معنی تجارت کرنے کے ہیں۔ بوہرا بھی اسی لفظ سے مشتق ہے۔ چونکہ یہ قوم تجارت ہی کرتی ہے اس لئے ان کو بوہرا یعنی بیوہار یا بیوپار کرنے والا کہتے ہیں۔ یہ نام صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ ہندوؤں کا بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں ۶۶۵۲ ہندوؤں اور ۲۵ جینیوں نے بھی اپنے آپ کو بوہرا ظاہر کیا تھا۔ مسلمان بوہروں کی تعداد اُس وقت ۱۳۶۵۵ تھی جن میں ۱۱۵۳۰ بمبئی پریسیدنسی سے تعلق رکھتے تھے۔

بوہرہ جماعت کے دو حصے ہیں، بڑا حصہ تجارت پیشہ لوگوں کا ہے اور یہ سب کے سب (جعفری بوہروں کو چھوڑ کر) شیعہ ہیں۔ دوسرا حصہ زراعت پیشہ بوہروں کا ہے اور یہ سب سنی ہیں۔

بعض شیعہ بوہرہ کہتے ہیں کہ وہ ان مہاجرین کی نسل سے ہیں جو عرب و مصر سے یہاں آئے تھے۔ لیکن اکثریت انہیں کی ہے جن کے آباؤ اجداد ہندو تھے اور جن کو اسماعیلی مبلغین نے مسلمان بنایا تھا۔ ان مبلغین میں سب سے پہلے عبداللہ تھے جن کو اسماعیلی جماعت کے امام مستعلی نے یمن سے بھیجا تھا اور جنہوں نے سب سے پہلے ۵۳۲ھ میں کیمبے (Camulay) آکر قیام کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مبلغ جو یہاں آئے ان کا نام محمد علی تھا جن کا مزار اب بھی کیمبے میں موجود ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انھلواڑا (گجرات) میں چالوکی خاندان کی حکومت تھی اور اس حکومت نے اسماعیلی تبلیغ کی اجازت دیدی تھی۔ جب ۱۲۹۷ھ میں یہاں کی ہندو حکومت ختم ہوئی اور ایک صدی تک گجرات دہلی کی سلطنت سے وابستہ رہا

تو اس زمانہ میں گجرات کے سنی حاکموں نے شیعہ بوہروں کے ساتھ کافی سختی کی۔

۱۹۶۶ء تک اس تحریک کا امام یمن میں رہا کرتا تھا اور بوہرے وہیں جا کر اپنی آمدنی کا دسواں حصہ پیش کیا کرتے تھے اور اپنے قصبہ انھیں سے طے کراتے تھے۔ لیکن ۱۹۶۶ء میں یوسف بن سلیمان، یمن سے ہندوستان آگئے اور مدھ پور میں قیام کیا (یہ مقام ریاست بڑودہ میں اب بھی موجود ہے)۔ پچاس سال کے بعد جب داؤد بن عجب شاہ (امیر جماعت) کا انتقال ہوا تو بوہرہ جماعت میں اختلاف پیدا ہوا۔ گجرات کے بوہروں نے داؤد بن قطب شاہ کو اپنا امیر منتخب کر کے یمن اطلاع دیدی۔ لیکن اہل یمن نے سلیمان کو مستحق قرار دیا جنھیں داؤد بن عجب شاہ نامزد کر گئے تھے۔ سلیمان یمن سے یہاں آئے، لیکن بہت کم لوگوں نے انھیں امیر تسلیم کیا۔ ان کا انتقال احمد آباد میں ہوا اور وہیں ان کا بھی مقبرہ ہے۔ انکے ماننے والے بوہرے سلیمانی بوہرے کہلاتے ہیں جن کی تعداد بہت کم ہے اور ان کا امام یا داعی، یمن میں رہتا ہے، اور نائب داعی بڑودہ میں۔ داؤدی بوہروں کی جماعت بہت بڑی ہے، اور ان کے داعی یا امام اخیر اٹھارہویں صدی عیسوی سے سورت میں رہتے ہیں، اور تمام معاملات میں ان کا حکم فیصلہ مطلق سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ داؤدی بوہرے اپنی آمدنی کا پانچواں حصہ داعی کے پاس بھیجتے ہیں اور شادی وغیرہ کے موقعوں پر بھی نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ جہاں جہاں بوہروں کی جماعت کافی پائی جاتی ہے وہاں نائب امیر بھی رہتا ہے۔ ملاطہر سیف الدین سے میں ۱۹۶۶ء میں ملا تھا۔ بہت مراعض و فعال شخص ہیں۔

جب ۱۶۲۲ء میں ان کے داعی شیخ آدم کا انتقال ہوا تو انھوں نے اپنے بیٹے شیخ طیب کو اپنا جانشین نامزد کیا لیکن بوہروں کی ایک جماعت نے شیخ طیب کے بیٹے علی کی طرفداری کی اور علوی بوہرے کہلانے لگے۔ بعد کو ۱۷۸۹ء میں کچھ لوگ پھر علی کی امامت سے علاحدہ ہو گئے جنھیں ناگوشی (یعنی گوشت نہ کھانے والا) کہتے ہیں کیونکہ انھوں نے گوشت کھانا گناہ قرار دیدیا تھا۔

اس جماعت کے مذہبی عقاید کی کتابیں راز میں رہتی ہیں۔ جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ زیادہ تر نماز روزہ کے مسائل سے متعلق ہیں۔

جعفری بوہرے، داؤدی بوہروں کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے ہیں، جو مظفر شاہ (۱۳۰۰ھ - ۱۳۱۱ھ) اور دوسرے شاہان گجرات کے عہد میں سنی ہو گئے تھے۔ یہ سید احمد جعفری شیرازی کے ماننے والے ہیں جو پندرہویں صدی عیسوی میں پائے جاتے تھے۔

اطلاع کے لئے ٹکٹ بھیجا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

خدا حافظ !

(دیارِ دوست)

چراغِ انجمن بھڑکا ہے کیا کیا
وہ بے مضرب لو دیتے ہوئے ساز
وہ کھلایا ہوا چہرہ گلابی ، ،
وہ تاحۂ نظر اک صبح بے شام
کسی آذر کدے کا مرمری خواب
وہ زلفوں کی گھٹائیں تیرہ و تار ،
ہوائیں عطر میں دھلتی ہوئی سی ،
دئے جلتے ہوئے دیرو حرم کے ،
سحر تک جاگتی راتوں کے آنسو ،
وہ کچھ بھیگے ہوئے رخسار کے پھول !!
وہ اک عالم کدہ شکاری نہستی
نظر کا سوگ ! خاموشی کا ماتم !!

وہ دل پھیلے پیر دھڑکا ہے کیا کیا
وہ گہرائی ہوئی نظروں کی آواز
وہ آنکھیں ! وہ خمارِ نیم خوابی ،
وہ اک مرکز پہ خورشیدِ لب بام
وہ مسجودِ نظر سینے کی محراب
وہ ہونٹوں کی شفق ، وہ صبحِ رخسار
وہ زلفیں دوش پر کھلتی ہوئی سی
وہ آنکھیں ، وہ فسانے کیف و کم کے
اُن آنکھوں میں مناجاتوں کے آنسو
وہ آنسو پونچھ کر ہنسنے کا معمول ،
گھٹا احساس کی کھلتی برستی ،
نہ کچھ کہنے نہ کچھ سننے کا عالم ،

وہ اُس کا احتیاطاً سکراتا !!
پٹ کر رہ گئے کتنے زمانے ،
تجھے کس کس طرح اُس نے پکارا !!
محبت کتنے اشکوں سے دھلی ہے !!

وہ اپنے سے خود اپنا غم چھپاتا ،
فضا دہرا گئی کتنے قسائے ،
لبِ خاموشی کا لے کر سہارا
تمنا کتنے خوابوں میں تکی ہے ،

دئے جن کے ہواؤں سے لڑے ہیں، وہی آذر کدے سونے پڑے ہیں
 حرم آوارہ بُت خانہ فراموش!
 کہاں ہے سچ بتا او خانہ بردوش؟

(شاعر)

یہ جھوٹی صبح، یہ کاذب اُجالا،
 یہ زخمی عصمتیں، یہ چاک دامن،
 تصور میں نہ تھا اس صبح کا روپ
 نہ تھی یہ سوچنے پر عقل مجبور
 ہو شہروں میں چھڑکیں گی گھٹائیں،
 ”بہاروں“ میں جلیں گے آشیانے
 ہو پنی پی کے توڑے جائیں گے جام
 یہ سناٹوں کی طغیانی رہے گی
 حرم والے کریں گے اپنا ماتم،
 فغانِ گردشِ ایام کہہ دے
 ترا ماحول وہ سنگین دیوار
 مجھے اُس سیرزمیں کی صبح کا غم
 نہ تو میری نہ تیرا درد مساز،
 چمن کے دام میں کیا آئیں گے ہم
 مچلتی آندھیر ٹھہر د میں آیا
 ابھی ”جنت“ سے کا شانہ اُٹھایا!!

پروفیسر شہزاد

صبح سے پہلے

یہ شعلہ زار، یہ آدم، یہ فطرت چالاک
یہ بزم فکر و نظر، یہ دلوں کی دیرانی
کہاں وہ لذتِ ایماں، کہاں وہ حسنِ خیال
یہ روشنی کے نشیمن میں ظلمتوں کا ہجوم
یہ بے کنار افق آفتاب کا مدفن،
یہ بے بسی کی ہوائیں، یہ تہقہوں کا غبار
سرابِ دولت و سطوت، فریبِ علمِ کلام
جھکا ہوا ہے سرِ زندگی اجل کے حضور
تڑپ رہے ہیں اندھیرے میں کتنے ماہِ تمام
سمنِ کدوؤں نے تباہی کے گیت گائے ہیں
بنامِ خود نگری خود فروش ہیں کتنے
جہاں شوق میں آئے ہیں زلزلے کیا کیا،
ربا پ حسن و صداقت کے تار ٹوٹ چکے
ہوئی ہیں کتنے شہیدوں کی تربتیں پامال
سُگ رہا ہے عروسِ حیات کا آنچل
وہ جھومتے ہوئے لعل و گہر کے سانپ اُٹھے

یہ راتِ دن، یہ گریبانِ شمس و ماہ کے چاک
یہ شامِ غم، یہ مشیت کی جبر سامانی
یہ کاوشِ غم گیتی، یہ گردِ دُش مہِ سال
یہ برق ریز حوادث، یہ فتنہ کارِ نجوم
یہ بے کسی کے جنازے، یہ حسرتوں کے کفن
یہ آنسوؤں کا تلاطم، یہ زندگی کے مزار
یہ خافقہ کے پھندے، کلاہ و قصر کے دام
یہ تاج و تخت کے ہیرے، یہ موت کے ناسور
یہ جرم و جہل کے طوفان، یہ بارشِ آلام
خزاں کی زد میں شگوفے جو مسکرائے ہیں
نہ پوچھ رہیں عرفاں و ہوشس ہیں کتنے
جھٹک رہے ہیں امیدوں کے قافلے کیا کیا
یقین و کفر متاعِ حیات لوٹ چکے
نہ وہ سرورِ حقیقت نہ وہ طلسمِ جمال
اُڑ رہی ہے سیاہی کہ بجھ رہے ہیں کنول
وہ تھر تھرائے محل، وہ ضمیر کا نپ اُٹھے

جھٹک رہے ہیں ابھی تو سیاہیوں کے ایاغ

یہ کس نے صبح سے پہلے بجھا دئے ہیں چراغ!

افسرِ سیلابی احمد نگری

اعتراف

یہ سچ ہے تم کو گل گلشنِ جنان نہ کہا
تمہاری نرگس میگوں کو سچاں نہ کہا
خطا معاف، یہ سب ہیں ہوس کی تعبیریں
عیاں نہ ہو جو نگاہوں سے وہ محبت کیا
بیان کرے گی زبانِ زخمِ دل کی حالت کیا
دلوں کے راز کی محرم، بھلا زبان کیوں ہو
نہیں ہے دستِ طلب کو گل و ثمر کی ہوس
ہو اے سیرِ گلستاں، نہ رہے قیدِ نفس
تری نظر سے ہیں کاوش و غلش مقصود
جگر کے خون سے رنگیں ہے تھرو باہم حیات
چھلک رہا ہے مے شوق سے یہ جامِ حیات
یہ مشتِ خاک، یہ صحر، یہ سیلِ رنج و بلا
یہ آسمان پہ ستاروں کی گردشِ پیہم
ہے سوزِ ہجر سے ہستی ہر ایک کی قائم
سکون ہے موج کو ہر دم رواں دواں رہنا
وصال، مرگ و ہلاکت، فراقِ سوزِ تمام
یہی ہے رازِ حیات اور یہی بقائے دوام
نصیبِ اہل ہوس ہو، وصال کی لذت
نہ شکر ہو نہ کبھی شکوہ ہائے ہجوری
خراپیِ غمِ اُلفت ہے دل کی مہموری
جگر کے خون سے ہستی مری گلستاں ہے

تمہارے عارضِ رنگیں کو گلستاں نہ کہا
تمہارے لب کو لبِ جامِ ارغواں نہ کہا
نگاہِ عشق میں جچتی نہیں یہ تصویریں
جہیں سے جو نہ ہو پیدا ہو وہ عقیدت کیا
جو اشک بنے نہ ٹپکے وہ سوزِ اُلفت کیا
زباں، نگاہِ محبت کی تر جہاں کیوں ہو
نہ شوقِ سنبھلِ مشکین و غنچہ نورس
ہے عشقِ سینہ گداز می، حیاتِ سوزِ نفس
دلِ فسرہ کو اک سوزش و تپش مقصود
تپش سے عشق کی قائم مرا نظامِ حیات
مثالِ نورِ سحر، جلوہ ریز، شامِ حیات
خدا کا شکر محبت ہے تند و بے پروا
کشاکشِ بہم و ربط و جذبہِ وایم
وصال ہو تو نظامِ حیات ہو بہم
حیات کیا ہے۔ جدائی میں پر فشاں رہنا
اسی فراق سے موجیں ہیں تند سیرِ مدام
اسی تپش سے ہر اک شے جہاں میں گرم خرام
مجھے۔ یہ سوز و تب و تاب و دوری و فرقت
سرورِ بادۂ قربت، نہ تلخیِ دوری
فراق، لذتِ پیہم، وصال، رنجوری
نفس کے سوز سے ہر شب، شبِ چراغاں ہے
پرویشِ شمسِ شیدائی ام۔ اے (سہلٹ)

انتخاب کلام سالک دہلوی

اے کاش تم آجاتے اغیار ہی کو لیکر
 کچھ عمر تو گھٹ جاتی گو رنج سوا ہوتا
 افزدوں ہے رنج عشق سے اندوہ ترک عشق
 پر ہیز کر کے ہم ہوئے بیمار دیکھنا
 پہلے ستمگری کے لئے آسماں بنا
 کچھ بات رہ گئی تھی جو وہ دلتاں بنا
 مجھ سے ستم رسیدہ کا ہوگا کوئی سرشک
 قطرہ کا نام مفت میں طوفاں نکل گیا
 کہلاتے ہو کیوں وعدہ فراموش جہاں میں
 آجاؤ کہ میں آپ میں اکثر نہیں ہوتا
 ہم بیٹھے ہیں یوں منتظر اُس راہ گزر میں
 گویا کہ اُسی شوخ کے ٹھیرائے ہوئے ہیں
 خدا کرے کہ سمجھ جائیں یہ کتنا یہ وہ
 ابھی تو چرخ بریں کا گلا گئے جاؤں
 نقاب چہرہ سے الٹو کہیں کہ میں کب تک
 شکایت نگہ نارسا کئے جاؤں
 واں ایک کھیل برہمی روز گاہ ہے
 وہ انجمن میں آئیں تو سپہرا انجمن کہاں
 کچھ تغیر مرے احوال پریشاں میں نہیں
 ایسے عالم میں ہوں جو عالم امکاں میں نہیں
 سچ ہے صحرا میں نو آموز جنوں کا کیا کام
 خاک اڑانی بھی نہ آتی ہو تو کیا خاک کروں
 اگر نہ وعدہ کرو انتظار کیونکر ہو،
 سکون خاطر امیدوار کیونکر ہو
 گرچہ ہے آمد جاناں کی خبر بازاری
 ہے مگر سالک مضطر کے سنا دینے کی
 آگے یادِ ستم ہائے گزشتہ اُن کو
 ہائے کرنا ہی نہ تھا شکوہ بیداد مجھے
 در پہ تھا قاصد نوید وصل یار آنے کو تھی
 آج ہی کیا موت اے پروردگار آنے کو تھی
 زباں کٹ جائے گریب سے تمہارا کچھ گلانکے
 مگر یہ تو کہوں گا تم کو کیا سمجھا تھا کیا نکالے
 اس کے آنسو ٹپک پڑے سالک
 حال اس درد سے کہا تو نے
 سالک خدا کے واسطے چھڑو کچھ اور ذکر
 بوجھو خبر نہ کچھ دلِ حسرتِ مآل کی،
 جو پاس ہیں مرے وہ خدا جانے کہاں ہیں
 تم دور ہو پر بیٹھے ہو گویا مرے آگے
 ہم سے بھی ملکر گیا روتا ہوا سالک ابھی
 کیا ارادہ ہے خدا جانے کہ ہر جانے کو ہے
 حسن حیرت خیز نے پہوش سب کو کمر دیا
 آج خلوت میں ہے گویا جو تری مغل میں ہے

مطبوعات موصولہ

نادرات غالب

تالیف ہے آفاق حسین صاحب آفاق کی جو میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ وہی میرن صاحب جن کے نام کے خطوط اردوئے معلیٰ میں نظر آتے ہیں۔
غالب کے مخصوص احباب میں میرن صاحب کے علاوہ ایک اور ایک صاحب منشی بنی بخش حقیر بھی تھے جو آگرہ میں رہتے تھے۔

یہ مجموعہ غالب کے انہیں خطوط کا ہے جو انہوں نے حقیر کے نام لکھے تھے اور اس وقت تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔ ان خطوط کا مجموعہ میرن صاحب کے پاس محفوظ تھا جو ان کے نور سے آفاق صاحب کو ملا اور جسے اب انہوں نے نادرات غالب کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس تالیف کی صحت یہی خصوصیت نہیں ہے کہ وہ غالب کے ہم غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے بلکہ آفاق صاحب نے اس کو اپنے حواشی سے بڑے کام کی چیز بنادیا ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے منشی بنی بخش حقیر کے حالات بڑی محنت سے فراہم کر کے لکھا کر دیے ہیں اور پھر غالب ہی کے خطوط سے ان کی اہلی وادبی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اس سے قبل تاریکی میں تھے۔ کتاب کا حصہ ۱۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرے حصہ میں حقیر کے نام کے خطوط ہیں اور اخیر میں حواشی درج ہیں جنہوں نے اس تالیف کو بہت زیادہ کارآمد بنادیا ہے۔ ان حواشی میں تمام ان لوگوں کے حالات درج ہیں جن کا ذکر غالب اپنے خطوط میں جا بجا کیا ہے۔ اور اس حیثیت سے یہ کتاب واقعی ”نادر“ کہلائے جانے کے قابل ہے، کتابت وغیرہ بھی بہت صاف ہے۔ قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے۔
لئے کا پتہ :- ماسٹر الطاف حسین منیر ادارہ نادرات ۴۶۔ منیر پارک۔ کراچی۔

ایکینہ شعر

مجموعہ ہے بشیر النساء بیگم بشیر حیدر آبادی کی نظموں اور غزلوں کا۔ جس میں غزلیں کم اور نظمیں زیادہ ہیں۔ پہلے نعت و منقبت کی نظمیں ہیں، اس کے بعد انکار و اذکار کے عنوان سے اخلاقی و اصلاحی نظمیں نظر آتی ہیں اور اخیر میں مقامی نظمیں ہیں جو زیادہ تر سرزمینِ دکن اور مہاراشٹر آصفی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جذبات اور فن دونوں حیثیتوں سے اس مجموعہ میں بھی اکثر وہی باتیں پائی جاتی ہیں جو اس عہد کے دوسرے شاعروں کے کلام میں نظر آتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یہ مجموعہ ایک خاتون کی تصنیف ہونے کی حیثیت سے ہم کو زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس کی کمزوریوں

کی طرف نگاہ کم جاتی ہے۔ اچھا ہوتا اگر نظمیں اشاعت سے قبل کسی ماہر فن کی نگاہ سے گزر جاتیں۔

طباعت و کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور جلد خصوصیت کے ساتھ بہت نفیس طیار کی گئی ہے۔ ضخامت

۲۳۲ صفحات۔ قیمت چھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

پیام نو مجموعہ ہے مختلف شعراء ملی و قومی نظموں کا جنہیں وقار شدی نے انتخاب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے جن شعرا کی نظمیں انتخاب کی گئی ہیں ان میں جدید و قدیم معروف و غیر معروف سبھی شامل ہیں لیکن ترقی پسند شعراء میں سے صرف دو چار ہی کا نام نظر آتا ہے۔

ہر نظم کی ابتدا میں شاعر کے حالات بھی درج کر دیے ہیں اور اس طرح اس کتاب نے ایک تذکرہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

ضخامت ۲۲۲ صفحات۔ کتابت و طباعت بہت معمولی۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اشاعت اردو و ہند۔ دہلی۔

چچا کا اعمال نامہ اور دوسرے افسانے ۴۸ صفحات کا مختصر سار سالہ ہے جس میں محمد عیسٰی کے چند چھوٹے چھوٹے مزاحیہ "افسانچے" یکجا کر دیے گئے ہیں۔ یہ افسانے انگریزی

سے لئے گئے ہیں جن کا اظہار مصنف نے دیباچہ میں کر دیا ہے۔ قیمت ۱۱ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ حیدر آباد دکن۔

ثمرہ باغبانی تصنیف ہے ابوالحسن نذیر احمد خاں ملیح آبادی کی جو اس فن کے بڑے ماہر ہیں۔ یونیورسٹی آباد کا ہر شخص کا لحاظ احساس باغبانی واقع ہوا ہے، لیکن اس کتاب کے مصنف عملی حیثیت سے بھی بڑا زبردست قیمتی تجربہ رکھتے ہیں۔

اس کتاب کی خوبی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حکومت یوپی نے مصنف کو اس کی اشاعت کے لئے گرانقدر امداد دی تھی اور سرکاری ماہرین فن نے اس کو بہت پسند کیا ہے۔ وہ حضرات جو اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ نذیر برادر س۔ ملیح آباد ہاؤس۔ اصطبل چار باغ۔ لکھنؤ۔

الکلیات تصنیف ہے مولانا آزاد سبحانی، جنہوں نے گورکھپور میں عرصہ سے دائرہ ربانیہ قائم کر رکھا ہے، مولانا آزاد سبحانی ہندوستان کی نہایت معروف مہتممی ہیں اور اسی وقت سے جب انہوں نے تقریباً ایک چوتھائی صدی قبل کا پور میں مدرسہ الہیات کی

بنیاد ڈالی تھی، ان کے علم و فضل کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ ان کی زندگی اس وقت تک کسی نہ کسی تحریک کے قیام و ثبات کی کوشش ہی میں بسر ہوئی ہے، اور تحریک ربانی غالباً ان کی زندگی کی آخری تحریک کی ہو جسکو وہ کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب اسی تحریک کے عقایدی حصہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں انہوں نے تعلیمات مذہب پر بہت مفکرانہ و عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ لیکن انہوں نے جو حوام اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، کیونکہ یہ کتاب نصاب کی سطح پر تھی جو جسکی تفسیر غالباً دائرہ ربانیہ ہی بہتر کر سکتی ہے۔ قیمت پانچ روپیہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ربانیہ۔ گورکھپور۔

عروضی و صوتی خصوصیات

شاعری کلام موزوں کا نام ہے اور اگر اس میں موزونیت نہ ہو تو ”بگڑی ہوئی نثر“ ہے، اسی موزونیت کے پرکھنے کے لئے بحر، وضع کی گئیں اور تقطیع کے اصول بنائے گئے، لیکن شاعری دراصل صرف موزونیت ہی کا نام نہیں، بلکہ اس کے آواز وہ کچھ اور چیز بھی ہے جس کا تعلق جذبات، محاکات، لب و لہجہ، انتخاب الفاظ، صوتی اثرات اور جمالیاتی و غنائی احساس سے بھی ہے، اور انہیں تمام باتوں کے رکھ رکھاؤ سے ایک شاعر اپنی انفرادیت قائم کر لیتا ہے۔

جس حد تک زبان کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ میر انیس کو شعر کی دھلی ہوئی زبان استعمال کرتے تھے، لیکن آئیے اب ان کی شاعری کی دوسری خصوصیات پر بھی نگاہ ڈالیں۔

مولانا شبلی اپنے موازنہ میں ان بحروں کا ذکر کر چکے ہیں جو میر انیس نے استعمال کی ہیں اور یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ٹیپ کا شعر میر انیس کے کلام میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس نقطہ نظر سے جب ہم میر انیس کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو اس میں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں۔

تقریم۔ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ جس حد تک بصری احساس کا تعلق ہے، میر انیس نے اپنے آرٹسٹ ہونے کا بہترین ثبوت دیا ہے، لیکن مزید غور سے معلوم ہوتا ہے کہ سماعتی حس کی تسکین و آسودگی کے لئے بھی وہ کم اہتمام نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب بھی وہ ان جزئیات کو پیش کرتے ہیں۔ جن کا تعلق سننے سے ہے تو وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی آوازیں ہمارے کانوں میں گونج جاتی ہیں مثلاً:-

کو کو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

یا ————— جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھاریں

وہ ہر قسم کے حسی تاثر کے لئے ایسے مناسب الفاظ لاتے ہیں کہ ان سے ہماری حس بیدار ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت عباس غصہ میں ایک تقریر فرماتے ہیں، اس بند کے صوتی اثرات ملاحظہ ہوں:-

عباس دلاور نے کہا ہو کے غضبناک تو کاٹے گا شیروں کے گلے اور سگِ ناپاک

آگے مرے یہ بے ادبی منہ میں ترے خاک بیکس ہوا ایسا پسیر سیدِ لولاک !

کیوں رکھ دوں لبِ نجس پہ انگشتِ نال کو

دکھلا دوں مزا چسید کے نیزے سے زباں کو

اسی طرح جنگ کا سماں کھینچنے میں اس کا شور و شغب الفاظ کے صوت ہی سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً:-

نقارہ دغا پہ لگی چوب یک بیک، اشعا غریب کو س کہ ہٹنے لگے فلک،
شہپور کی صدا سے ہر سال ہوئے ملک قرنا پھنکی کہ گونج گیا دشت دور تک

شور دہل سے حشر تھا افلاک کے تلے

مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

اسی طرح فوج کی طیارسی میں کھڑکھڑاہٹ کو صوت لفظی کے ذریعہ یوں واضح کیا گیا ہے:-

لشکر کے سب جہول تھے لڑائی میں جی لڑائے وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے

ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑ گڑائے غصے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے

ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعین کے پاؤں

ماہی پہ ڈمگا گئے گاؤں زمین کے پاؤں

اسی طرح کی بے شمار مثالیں میر انیس کے مرثیوں میں ملتی ہیں اور وہ شاعر جو صوتی اثرات نہ پیدا کر سکے بڑا شاعر نہیں ہے۔ تاسخ اور ذوق کے یہاں ہمیں یہ صفت نہیں ملتی اس لئے ہم ان کو فطری شاعر کہنے کے لئے طیار نہیں ہیں۔ تمیز غالب اور انیس کے یہاں یہ چیز اس طرح ملتی ہے کہ ہم اس کے خصوصیات کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور اس کے اثر سے انوس ہو کر شاعر کے کلام کو اسی طرح پہچان سکتے ہیں جیسے کہ اپنے کسی دوست کی شکل کو۔ انیس کے ترنم میں ہم کو حسب ذیل خصوصیات ملتی ہیں:-

(۱) کھنچا ہوا ترنم (LONG) یہ ترنم قمر کی چھوٹی بچروالی غزلوں کے ترنم سے جدا ہے اس کا اثر اس بے پت راگ کا سا ہے جس میں بہت ٹھیراؤ پایا جاتا ہے اور جس وقت ہم اس انداز کے بند پڑھتے ہیں، تو ہم خود ان کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور وقفہ کی ضرورت کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مصرعہ ہے:- جب۔ قطع کی۔ مسافت شب۔ آفتاب نے۔ ان مقامات سے جہاں ہم نے (-) نشان بنا دیا ہے یقیناً ٹھہرتے ہوئے گزریں گے۔

(۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ترنم بہت لطیف ہے۔ اس میں وہ ردائی نہیں ہے جو کسی تیز بہتے ہوئے دریا یا آبشار میں ہوتی ہے بلکہ ایک آہستہ دریا کی سی ہے جس کا بہاؤ متانت لئے ہوئے ہو۔ یہ صفت غالب کے ترنم کی متضاد ہو غالب کے اشعار کا بہاؤ نہایت تیز ہے اور میر انیس کے مصرعوں کا نرم و سبک۔

(۳) تیسری خصوصیت اس ترنم کی یہ ہے کہ وہ شیریں ہے۔ ان کے مرثیوں کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت میٹھا راگ ہمارے کانوں میں جا رہا ہے۔ میر انیس نے کہا کہ ان کے اشعار ایسے ہوں کہ ”ہر گوش بنے کانِ خلاصت وہ نیک ہو“ اور اسی کو ہم مٹھاس سے تعبیر کر رہے ہیں۔ پڑھنے میں ان کے اشعار ہماری زبان پر بھی ایک غمزہ چھوڑ جاتے ہیں اور ہمارے کان بھی اس سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اگر کسی خاص اثر کو پیدا کرنے کے لئے وہ کثرت الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں تو اس طرح کہ وہ ان کے کلام کی شیرینی میں گھل مل کر مٹھے ہو جاتے ہیں۔

۴۔ چوتھی خصوصیت اس کی متانت ہے جس میں رسمی غم کا اثر نہایت خوبصورتی سے ملا ہوا ہے۔ مجلس اظہار غم کے لئے ہوا کرتی تھی اور اس میں اگر ہر مجلسی ہر آن رویا نہیں کرتا تھا تو بھی اس پر غم کا اثر ضرور طاری رہتا تھا۔ یہ اثر میر انیس کے اشعار میں رچ گیا تھا، اسی لئے جب ہم ان کے مرثیوں کو پڑھتے ہیں تو ان کی آواز ہی ہم کو غم سے مانوس کر دیتی ہے۔ اس کا تعلق مرثیہ خوانی سے بھی ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو خاص انداز سے نہ پڑھے تو مرثیہ کا اثر آدھا رہ جاتا ہے۔ خاموشی کے ساتھ پڑھنے میں اس کا اثر وہی قبول کر سکتے ہیں جو گہرا تنقیدی شعور رکھتے ہیں ورنہ اس کا بہترین اثر اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی نختہ کار مرثیہ خوان اس کو پڑھے۔ اکثر ان لوگوں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں جو بالکل نہیں سمجھتے، اس کا سبب یہ ہے کہ انیس کا ایک مخصوص لب و لہجہ تھا جس سے عوام بھی مانوس ہو گئے تھے اور یہ انیس کی وہ انفرادیت تھی جس میں بہت کم شاعران کے مماثل نظر آتے ہیں۔

اوزان — ہمارے یہاں شاعری کو بہت سطحی طور پر دیکھا گیا ہے۔ یوں تو الفاظ سے تصویر کشی ہر ادیب کر لیتا ہے، مگر شاعر کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے تصویر کشی کرتا ہے اس مقصد کے موافق ایک مخصوص شعری وزن بھی پیدا کرے مثلاً سعدی کا ایک شعر ہے:-

اے سارباں آہستہ رال کارام جانم می رود
واں دل کہ با نمود داشتہ باد لستام می رود

اس کے اوزان پر غور کیجئے تو اس میں اونٹ کی رفتار کی رعایت بھی نظر آئے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل پر اونٹ کا رفتہ رفتہ دور ہوتے جانا ایک دردِ دراک پیدا کر رہا تھا اور اسی راگ کو اس شاعر نے الفاظ میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اگر کوئی شاعر اس شعر کو اس وقت کہتا جبکہ اس کا معشوق ریل میں جا رہا ہوتا تو کیا یہ وزن موزوں ہوتا، ہرگز نہیں۔

دلی سے لیکر داغ تک ہمیں صرف ایک قسم کی شاعری ملتی ہے اس میں کچھ افراد کی انفرادی صفات کو الگ رکھتے ہوئے ہم یہ پاتے ہیں کہ ایک ہی قسم کے اوزان سے کام لیا گیا ہے۔ جو زیادہ تر روایتی ہیں اور صرف چند بڑے شاعران سے اپنی فطرت اور اپنے خیالات کے مطابق موزوں اثرات پیدا کر سکے ہیں، میر انیس ان تمام شاعروں میں نمایاں ہیں، اور بحروں کے انتخاب میں وہ بڑے سلیقہ سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایسی بحر اختیار کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اس کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے، یعنی الفاظ کا آثار چڑھاؤ بھی خیال کے بالکل مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً گھوڑے کی لڑائی کے وقت چال کے بیان کرنے کے لئے جو بحر انھوں نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے:-

سمٹا۔ جما۔ اڑا۔ ادھر آیا ادھر گیا
چمکا۔ بڑھا۔ جھلا دکھایا۔ ٹھہر گیا

ہم کو ان کے یہاں زیادہ تر وہی بحر ملتی ہیں جو مجلس کی فضا کے لئے موزوں ہیں۔ مجلس چاہے سوز خوانی کی ہو یا حدیث خوانی، سینہ کو بی کی ہو یا تحت اللفظ خوانی کی سب کا مقصد ایک خاص قسم کا غم طاری کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ ان بحروں سے پیدا نہیں ہو سکتا جو بیان نشاط کے لئے موزوں ہیں اس کا تعلق بالکل ذوق سے ہے اور اس کی تشریح ممکن نہیں۔ ماتم اور سینہ کو بی

میں ہر ضرب کے بعد ایک وقفہ ہوتا ہے جسے ماتم کی تال یا وزن کہہ سکتے ہیں اور اگر کسی مرثیہ میں اس کا خیال نہ رکھا جائے گا تو وہ کسی ماتم خوان کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مصرع ہے: ”جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے“ اس میں پہلی ضرب قطع کی پر ہوگی، دوسری مسافت شب پر۔ بعد ازاں آفتاب کے پڑھنے میں ”آ“ کے بعد ایک معمولی سا ہچکولا ہوگا اور پھر تیسری ضرب ہوگی۔ میر انیس کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے جس موقع کے لئے جو مرثیہ لکھا ہے اس کی بحر بھی انہوں نے اسی کی مناسبت سے تلاش کی ہے۔ میر انیس سے قبل کے مرثیہ گوئیوں میں بھی ہمیں کچھ کچھ اسی کا پتہ چلتا ہے لیکن اتنا نہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بحر وں سے اُس زمانہ کی رفتار کا پتہ چلتا ہے۔ ہر سچے اور بڑے شاعر کے اوزان شاعری اس زمانہ کی خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں جس میں وہ پیدا ہوا بلا اور بڑھا۔ مثلاً الگزنیدر پوپ کے اشعار میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانہ کو ظاہر کرتی ہے جب ایک قوم اپنی معاشرت کو درست کر کے اسے خاص اصول پر چلا رہی تھی۔ میر انیس کے اوزان کا رکھ رکھاؤ اور اطمینان و سکون اس زمانے کی تہذیب کو پورے طور پر نمایاں کرتا ہے۔ میر انیس کے سامنے لکھنؤ کے شرفا کی زندگی تھی اور اس زندگی کی نوعیت یہ تھی کہ ہر شخص اپنے حال میں مگن تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ زمانہ ایک جگہ ٹھہر گیا ہے اور اس کی وضع میں تبدیلی کا امکان نہیں، اس لئے یہ لوگ اچھا برا جو کچھ بھی کرتے تھے خاص اطمینان کے ساتھ اور ایک خاص ڈھب کے مطابق کرتے تھے۔ میر انیس کے مرثیوں کے عام اوزان سے بھی ہم کو اس زمانہ کی سہل انکاری، متانت اور یکسانیت کا پتہ چلتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس خاص قسم کی زندگی سے مانوس نہیں ہیں ان پر میر انیس کے اشعار کا اثر کم ہوتا ہے۔ تاہم ان کے کلام میں ہم کو بعض ایسی خصوصیات بھی ملتی ہیں جو دوامی اثر رکھتی ہیں اور زمانہ و مقام سے ہٹ کر بھی ان کی قیمت علیحدہ مقرر کی جاسکتی ہے۔ میر انیس کا زمانہ لکھنوی تہذیب کے عروج کا بھی زمانہ تھا اور زوال کا بھی جسے ہم دوسرے الفاظ میں زوالی تہذیب ہی کہا جاسکتا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ ایسی تہذیب کے زمانہ میں اعلیٰ فطرت والے انسانوں کا فقدان ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ ذہین ہستیاں ایسے دور میں بھی پیدا ہوتی ہیں مگر ان کا رجحان مختلف ہوتا ہے اور وہ حال کی پستیوں میں مستقبل کی بھی فکر رکھتی ہیں۔ میر انیس نے بھی یہی کیا۔ چنانچہ ہر زبان کے کچھ قدرتی اوزان ہوتے ہیں اور جب اس زبان کی شاعری ان قدرتی اوزان پر آجائے تو وہ اپنی تکمیل پر پہنچتی ہے۔ میر انیس کی سچی شاعرانہ فطرت ان کو اکثر جگہ انہیں اوزان پر لے آئی ہے۔ میر مقصد یہ ہے کہ مراٹھی انیس میں بہت سے مصرعے ملتے ہیں جن میں بول چال کی زبان بالکل اسی ترتیب الفاظ کے ساتھ ملتی ہے جیسے کہ ہم بولتے ہیں اور یہ مصرعے پورے طور پر موزوں ہیں۔ اس وقت اردو میں بلینک درس اور فری درس پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی اور یہ کوشش تمام تر نا کامیاب ہے۔ کیونکہ ہمارے شاعر اپنی زبان کے قدرتی وزن پر دھیان نہیں رکھتے ہیں۔ ان معنوں میں میر انیس کی خدمت اردو شاعری کے لئے بہت ہی اہم ٹھہرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ہم کو وہ اوزان ملتے ہیں جو اردو کے قدرتی اوزان ہونا چاہئے۔

ہند کے چھ مصرعوں میں پہلے چار اور آخری دو ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ میر انیس نے ایجاد نہیں کیا اور نہ اس میں کوئی

تبدیلی کی، مگر اس کو اور اس کے اثرات کو اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچا دیا۔ ہند کے آخری دو مصرعے جن کو "ٹیپ" کہتے ہیں خاص اہمیت رکھتے ہیں، پہلے چار مصرعوں میں ایک بات کے چار حصے پیش کئے جاتے ہیں اور آخری دو مصرعوں میں اس کو زور کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ ہے:-

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
توفیق کا مبداء ہے توجہ کوئی دم کر گمنام کو اعجاز بیانیوں میں رستم کر
جب تک یہ چمک مہر کی پر تو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

اس پورے بند میں شاعر نے ایک دعا مانگی ہے۔ پہلے چار مصرعوں میں اس نے ایک ہی بات مختلف الفاظ میں کہی ہے اور آخری دو مصرعوں میں اس بات کو اور زوردار طریقہ پر ادا کیا ہے۔

دوسری نوعیت یہ ہے کہ شاعر جب کسی چیز کی تصویر کھینچتا ہے تو ہر مصرع اس طرح کام کرتا ہے۔ جیسے رنگ بھرتے وقت کسی مصور کا برش، یعنی یہ کہ ہر مصرعے میں تصویر کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے اور ٹیپ میں یہ سب جزئیات روشن کر دئے جاتے ہیں اور پوری تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے مثلاً:-

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زراخسبم نثار صبح سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح

تھا چرخ اخضر پی یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

یہاں پہلے مصرعے میں تو صبح کی سرخی۔ دوسرے میں تمام آثار شب کا غائب ہونا۔ تیسرے میں ستاروں کا چھپنا۔ چوتھے میں عبادت گزار لوگوں کی مصروفیت سب صبح کے جزئیات ہیں ان سب سے زیادہ اہم جزو سورج کا نکلنا ہے اور اس جزو سے شاعر نے تمام تصویر کو ایک خاص رنگ دیدیا ہے۔ بالکل اسی طرح اس بند میں گرمی کا سماں ملتا ہے:-

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھائے آہونہ مخد نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا سہتا مکدر غبار سے گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھٹن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

اسی ترتیب کے ساتھ ہم کو جنگ کے حالات کی بھی مکمل تصویریں ملتی ہیں:-
قبضہ میں تیغ لیکے پکارے شہ زماں ہاں ناوکا فگنی مجھے دکھلا تو ہے جواں

ہاں نکلی موند سے یاں کہ کھنچی اُس طرف کماں
کھینچنا کمان کا تھا کہ چلا تیرے اماں
حلقہ ادھر کمان کا خم ہو کے رہ گیا
یاں تیغِ ستہ سے تیر قلم ہو کے رہ گیا

ان مثالوں سے بند کے متعلق ہم بہت سے نتائج نکالتے ہیں:-

پہلا یہ کہ اپنی ساخت کے لحاظ سے بند بیانیہ شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ مصرعوں کے اوزان، ہم قافیہ چار مصرعوں میں کسی بیان کے الگ الگ حصے اور آخر کے دو ہم قافیہ مصرعوں میں اس بیان کا اہم ترین جزو یہ سب مل جل کر ایک ایسا سانچہ پیش کرتے ہیں جن میں ایک تصویر بہت عمدہ طریقہ پر ڈھل سکتی ہے۔ افسانوی شاعری جس میں واقعات کا بیان ایک تیز تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے، بند کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی، کیونکہ ایسا بند قصہ کے تسلسل کو خراب کر دے گا اور قصہ کی دلچسپی سے دھیان کو ہٹا کر بیان کی طرف لچائیگا۔ ایک ہی چیز کا بار بار مختلف الفاظ میں چار مصرعوں میں دہرانا بھی افسانوی نوعیت پر بار ہوگا۔ افسانوی شاعری کیلئے بیت ہی دنیا بھر کی شاعری میں زیادہ موزوں سمجھے گئے ہیں۔ ڈرامے بھی بیتوں ہی میں لکھے گئے مگر جب بیتوں کی قافیہ پیمائی، روانی اور بے ساختگی میں حائل ہوتی تو ڈراموں کو غیر مقفیٰ اشعار میں لکھا گیا اور بلینک ورس اسکے لئے موزوں ثابت ہوئی۔ یہاں پر انگریزی شاعری کے ایک خاص بند کا ذکر نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بند اسپنسر کا ایجاد کیا ہوا ہے جسکو اسکے نام سے مٹھوپ کیا جاتا ہے۔ اسکی ساخت بھی ہمارے مسدس کی سی ہے اور اسپنسر نے اپنی مشہور نظم فری کوئن کے لئے اسکو ایجاد کیا تھا۔ فری کوئن کو اسنے ایک اخلاقی ایپک بنانے کی کوشش کی تھی اور اس میں تمثیل کے ذریعہ ارسطو کی اخلاقیات کے مطابق ۱۲ اعلیٰ اخلاقی صفتوں کو مجسموں میں تبدیل کر کے ہر ایک کی دنیا میں سرگزشت بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں آخری مصرع پہلے مصرعوں سے اوزان اور لمبائی میں مختلف ہے اور ہر جگہ اس مصرعہ سے وہی کام لیا گیا ہے جو بند میں ٹیپ سے لیا جاتا ہے۔ بائرن نے اسپنسر کی تقلید کی لیکن وہ ناکامیاب رہا، البتہ کیٹس کامیاب ہوا جسکی فطرت بیانیہ شاعری کے لئے زیادہ مناسب تھی۔ اس سے ہم نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ مسدس میں ایپک شاعری نہیں ہو سکتی یعنی گہرے فلسفی خیالات کے لئے یہ سانچا موزوں نہیں ہو کیونکہ یہاں پہلے چار مصرعوں میں ایک ہی مضمون کو کئی طرح دہرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میر انیس بیانیہ شاعری کی طرف فطری مناسبت کی وجہ سے مسدس کو زیادہ تکمیل کے ساتھ استعمال کر سکے۔

مسدس اُس شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہے جو مقرری سے تریبہ تہ ہو یعنی جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ کسی مجمع کو متاثر کرنے کے لئے پڑھی جائے۔ تقریر اور تحریر کا اہم فرق یہ ہے کہ تقریر میں ہم ایک بات کو بار بار مختلف الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور اختصار کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ چونکہ بند میں پہلے چار ہم قافیہ مصرعوں میں ایک ہی بات کو بار بار دہرانا ضروری ہے اس لئے اس کا مجمع پر اثر زیادہ اچھا ہو سکتا ہے۔ مرثیوں میں مسدس کے کامیاب ہونے کا راز یہی ہے کہ مجلس کے لئے ایک ایسی صنف کی ضرورت تھی جس میں مقرری زیادہ ہو۔

ایک بات اور ہے کہ مسدس کا اثر سامعین پر مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ٹیپ کے شعر کے لئے سننے والے

پہلے ہی سے گوش بر آواز رہتے ہیں اور اس طرح ان کا دھیان ٹہنے نہیں پاتا اور ٹیپ کا بند دہی کام کرتا ہے جو موسیقی میں تال۔
 دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ شاعر بیان کرتا ہے اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میر انیس جب
 ممبر رپاکو مرثیہ پڑھتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ منظر سامنے آگیا۔ یہ بات میر انیس کے طرز مرثیہ خوانی کی تعریف میں کہی جاتی ہے۔
 اس میں شک نہیں کہ شاعری کا بہت کچھ اثر اس کے پڑھنے پر منحصر ہوتا ہے مگر ساتھ ساتھ یہ بات بھی نہ فراموش کرنا چاہئے کہ
 شاعری کے اوزان کا کسی موقع کے موافق ہونا اور اس کے پڑھنے کا طریقہ دونوں مل جل کر وہ جادو کا اثر پیدا کر سکتے ہیں جو
 ان صاحب نے محض پڑھنے کے طریقہ سے وابستہ کیا تھا۔

علاوہ اس کے بند کے مجموعی اثر کو پورے طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی طرز ادا اس کا لہجہ اسکے اوزان
 اور اس کی ساخت سب مل جل کر ایک غم کا راگ پیدا کرتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا بیان ہے کہ اگر کسی مرثیہ کو خاموشی کے ساتھ پڑھا جائے
 تو نیند آنے لگتی ہے یا دھیان ہٹ جاتا ہے مگر اگر اس کو با آواز بلند پڑھا جائے تو کچھ اور ہی اثر ہوتا ہے اور پڑھنے والوں اور
 سنتے والوں کو اگر روزانہ آئے تو کچھ رونے کا اثر دل پر ضرور طاری ہوتا ہے۔

اقلیم سخن میں میر انیس کی حیثیت

ہم نے مرثیہ نگاری پر جو کچھ لکھا ہے وہ اسی نقطہ نظر سے تھا جو میر انیس کے سامنے تھا یعنی یہ کہ صنف مرثیہ میں عربی فارسی اور اردو ادب کی تمام روایات جو چلی آتی تھیں ان میں میر انیس اپنے قوت بیان کے ذریعہ سے کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارا مقصد میر انیس کو انھیں کے اصول سے جانچنا تھا اور ان لوگوں کی غلطی ظاہر کرنا تھا جو خواہ مخواہ مرثیہ میں مذہبی غلو یا بے جا طعن داری کے تحت یورپی شاعری کے اصول پر اس کو جانچتے ہیں۔

سہرا دیب اپنے زمانہ و ماحول کا پابند ہوتا ہے اور اس سے باہر نہیں جاسکتا۔ یہ ممکن ہے کہ اسکے کلام میں کچھ چیزیں ایسی بھی ملیں جو کسی دوسرے ادب کی روایات سے کچھ مناسبت رکھتی ہوں مگر ان کی بنا پر کسی شاعر کو اہمیت دینا ویسا ہی ہے جیسا کہ یہ معلوم کر کے کہ سورج میں داغ ہیں یہ کہہ دینا کہ سورج کا رنگ کالا ہے۔ میر انیس نے ایک باریہ دعا مانگی تھی کہ :-

جب تک یہ چمک مہر کی پر تو سے نہ جائے اقلیم سخن میرے قلم و سے نہ جائے

اور اس میں شک نہیں کہ جو اقلیم سخن ان کے قبضہ میں تھی اس کے وہ بادشاہ تھے اور ہمیشہ بادشاہ رہیں گے مگر اس امر کے وضاحت کی ضرورت ہے کہ ان کی اقلیم کے کیا حدود ہیں۔

بحیثیت مرثیہ نگار۔ ظاہر ہے کہ ان کا فن صنف مرثیہ ہی سے تامل و الجسہ ہے۔ مرثیہ کے لفظی معنی کے لحاظ سے اس کے دائرے میں چاہے کتنی ہی قسم کی عربی، فارسی ادب کی نظمیں آجائیں مگر اردو مرثیہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مجلس کے لئے مخصوص ہونا۔ اس کا صرف امام حسین اور ان کے انصار کے واقعہ شہادت سے متعلق ہونا، اور اس میں نہ لادینے والا رنگ پیدا کرنا یہ تمام چیزیں اس کو دنیا کے تمام دوسرے مرثیوں سے مختلف کر دیتی ہیں۔ مرثیہ مذہب شیعہ کی خاص مذہبی چیز ہے جو مجلس عزائے دو جہ میں آیا اور رفتہ رفتہ بعض صاحب ذوق لوگوں کی توجہ نے اس کو ایسا ادبی درجہ دیدیا کہ یہ صنف اردو شاعری کی اہم ترین صنف ہو گئی، جس کے میر انیس یقیناً بادشاہ ہیں۔

فارسی اور اردو کی خارجی شاعری زیادہ تر قصیدہ یا قصیدہ کے رنگ کی چیز تھی۔ قصیدے یا تو بادشاہوں کی مدح میں ہوتے تھے یا پھر مذہبی پیشواؤں کی تعریف میں۔ مرثیہ نگاروں نے اس دوسرے قسم کی طرف خاص توجہ دی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ چونکہ کچھ حالات کا بیان بھی ضروری تھا اس لئے بزمِ بین اور بزمِ بھی اس میں لائی گئی، مرثیہ میں مناظر قدرت کے جو بیانات ملتے ہیں وہ قصیدوں کی بہاریہ تشبیہوں سے کسی طرح مختلف نہیں ہیں اور ان کا تمام شاعرانہ ادراک ویسا ہی مبالغہ آمیز ہے جیسا قصیدوں کا ہوتا ہے۔

مکتوبات نیازتین حصوں میں
 ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو
 جذبات نگاری، سلاست بیان
 رنگینی اور البیلین کے لحاظ سے
 انشاء میں بالکل پختہ ہیں۔
 اس کے خطوط غالب بھی بچے معلوم
 ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے
 اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا
 گیا ہے اور اس کا غلطیوں کا
 ہولی ہے۔ قیمت حاصل دوم
 فی حصہ تین روپیہ صد روپیہ چار روپیہ
 علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت
 حضرت نیاز کا وہ عظیم النظر
 افسانہ جو اردو زبان میں بالکل
 پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے
 اصول پر لکھا گیا ہے اس کی
 زبان و تخیل اس کی نزاکت و
 اس کی بلندی مضمون اور اس کی
 انشاء عالیہ سحر محال کے درجہ
 تک پہنچتی ہے۔
 اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے
 قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے
 علاوہ محصول

جذبات بھاشا
 جناب نیاز نے ایک دلچسپ
 کے ساتھ بہترین ہندی شاعری
 کے نمونے پیش کر کے ان کی
 ایسی تشریح کی ہے کہ دل
 بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں
 یہی سب سے پہلی کتاب اس
 موضوع پر لکھی ہے اور
 ہندی کلام کے بے مثل نمونے
 نظر آتے ہیں
 قیمت بارہ آنے
 علاوہ محصول

فلاسفہ قدیم
 اس مجموعہ میں حضرت نیاز
 کے دو علمی مضامین شامل
 ہیں :-
 ۱۔ چند کھٹے فلاسفہ قدیم
 کی دعوں کے ساتھ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ
 ۲۔ ادین کا مذہب -
 نہایت مفید و دلچسپ
 کتاب ہے۔
 قیمت ۱۔
 ایک روپیہ
 علاوہ محصول

شاعر کا انجام
 جناب نیاز کے خطوط شاعر
 لکھا ہوا افسانہ عشق و عشق کی
 تمام نشہ بخش کیفیات اس کے
 ایک ایک جمل میں موجود ہیں
 اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ
 سے اس قدر بلند چیز ہے کہ
 دوسری جگہ اس کی تفسیر نہیں
 دی جاسکتی۔ ازہ اڈیشن نہایت
 صحیح و خوش خط سرور دل رنگین۔
 قیمت بارہ آنے
 علاوہ محصول

فرست الید
 مولفہ نیاز فچپوری جس کے
 مطالعہ سے ایک شخص آسانی
 ہاتھ کی شناخت اور اس کی
 گہروں کو دیکھ کر اپنے
 دوسرے شخص کے مستقبل
 سیرت عروج و زوال، موت
 و حیات، صحت و بیماری،
 شہرت و نیک نامی پر صحیح
 پیشین گوئی کر سکتا ہے۔
 قیمت ایک روپیہ
 علاوہ محصول

لقاب اٹھ جانیکے بعد
 نیاز فچپوری کے تین افسانوں
 کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے
 کہ ہمارے ملک کے ادیبان
 طریقت و علم و کرام کی انسانی
 زندگی کیا ہے اور ان کا وجود
 ہماری معاشرت و اجتماعی
 حیات کیلئے کس درجہ کم فائدہ
 زبان پلاٹ و انشاء کے لحاظ
 سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے
 صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
 قیمت آٹھ آنے
 علاوہ محصول

مذاکرات نیاز
 یعنی حضرت نیاز کی ڈائری
 جو ادبیات تنقید عالیہ کا
 عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک
 اس کو شروع کر دینا اخیر تک
 پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جلد
 اڈیشن ہے جس میں صحت اور
 انفاست کا فائدہ طباعت کا
 خاص اہتمام کیا گیا ہے
 قیمت :-
 ایک روپیہ آٹھ آنے
 علاوہ محصول

انتقادات (دھتے)
 حضرت نیاز فچپوری کے انتقادی
 مقالات دو حصوں میں تقسیم
 کئے ہیں پہلے حصہ میں وہ مقالات
 ہیں جن میں خاص شعرا کے کلام
 پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن،
 ظفر، غالب، معصی، نظیر
 سیاب، جوش، مسعود وغیرہ
 دوسرے حصہ میں عام ادبی و
 انتقادی مباحث ہیں جو کاتعلق
 شعر و ادب کی تاریخ سے ہے
 قیمت حصہ اول ۱۰ روپیہ
 قیمت حصہ دوم ۱۰ روپیہ
 علاوہ محصول

مذہب
 حضرت نیاز کا وہ معجزہ آلا
 مقالہ جس میں انھوں نے
 بتایا ہے کہ مذہب کی
 حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا
 میں کیونکر رائج ہوا۔
 اس کے مطالعہ کے بعد
 انسان خود فیصد کر سکتا ہے
 کہ مذہب کی پابندی کیا
 بخیر رکھتی ہے۔
 قیمت ایک روپیہ
 علاوہ محصول

نگار نگار کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۷۹ء	جنوری ۱۹۷۸ء	جنوری ۱۹۷۷ء	جنوری ۱۹۷۶ء
اس نمبر میں ریاض فیض آبادی	اس نمبر میں ریاض فیض آبادی	اس نمبر میں ریاض فیض آبادی	اس نمبر میں ریاض فیض آبادی
مرحوم کے کلام کے متعدد	مرحوم کے کلام کے متعدد	مرحوم کے کلام کے متعدد	مرحوم کے کلام کے متعدد
مشاہیر نے نقد و سبھ کر کے	مشاہیر نے نقد و سبھ کر کے	مشاہیر نے نقد و سبھ کر کے	مشاہیر نے نقد و سبھ کر کے
بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری	بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری	بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری	بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری
کیا تھی۔	کیا تھی۔	کیا تھی۔	کیا تھی۔
قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول	قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول	قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول	قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری ۱۹۷۵ء	جنوری ۱۹۷۴ء	جنوری ۱۹۷۳ء
اس سال کا نام "ماجد دین نمبر" ہے جس میں ایک جھٹل	پاکستان نمبر "نگار نگار" جو فیض آبادی میں دنیا کے سامنے	پاکستان نمبر "نگار نگار" جو فیض آبادی میں دنیا کے سامنے
فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریکڈی کو اردو میں	اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش	اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش
منقول کیا گیا ہے۔ ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ	کیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کا	کیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کا
سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔	دو ندریں در آن کارناموں کو نہ بھول جائے چہر مسلم حکومت کی	دو ندریں در آن کارناموں کو نہ بھول جائے چہر مسلم حکومت کی
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول	ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول	ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

نگار نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ۔ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ (نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شائع ہوتا ہے اور ہر ایک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

نرخ نامہ اجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۹۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰ روپیہ	۱۵ روپیہ	۷ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵ روپیہ	۷ روپیہ	۳ روپیہ	۱۲ روپیہ

جواب کیلئے ملکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

کیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ "منیجر"